لذتِ صحرا نوردی

زہرا داؤدی

لذّتِ صحرانوردی

*

زہرا داؤدی

اشاعت ــ بار اوّل جنوری ۱۹۸۹ء
تعداد ــ ایک ہزار
طابع ــ زہرا داؤدی
مطبع ــ احباب پرنٹرز، ۲/۴۴۳، لیاقت آباد کراچی
کتابت خالد محمود
قیمت ــ پچیس روپے (پاکستان میں)
چار ڈالر (بیرون ممالک)

ملنے کے پتے

(۱) زہرا داؤدی
۱۰۱- آدم سینٹر، شاہراہ غالب
کلفٹن بلاک ۲، کراچی

(۲) شاہین داؤدی
3342- Grechen Road
Missi Sauga
Ontario L5 C1X9
CANADA.

انتساب

اپنی مرحومہ امّاں کے نام

جن کی شفقت و تربیت زندگی کے ہر مرحلے
اور ہر قدم پر میری رہنمائی کرتی اور حوصلہ
عطا کرتی رہی ہے اور جن کی یاد اور مثال
میرے لیئے اب بھی مشعل راہ ہے۔

زہرا داؤدی

لذّتِ صحرانوردی

اردو کے شہرہ آفاق شاعر شاد عظیم آبادی کے ایک ہونہار شاگرد تھے بسمل عظیم آبادی۔ غالباً ۱۹۲۱ء میں بسمل نے ایک غزل کہی تھی جس کا مطلع ہے

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

تحریک آزادی کے اس طوفانی دور میں بہت مشہور ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ جب عظیم حریت پسند نوجوان بھگت سنگھ اپنی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈالے تختہ دار کی طرف جا رہا تھا تو یہ شعر اس کی زبان پر تھا۔

اسی غزل کا دوسرا شعر ہے

رہرو راہ محبت رہ نہ جانا راہ میں
لذّت صحرانوردی دوریٔ منزل میں ہے

میں نے اپنی کتاب کے نام کے لئے اسی شعر سے "لذّت صحرانوردی" کا انتخاب کیا ہے۔ بسمل عظیم آبادی (مرحوم) کا مجموعۂ کلام "حکایت ہستی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس میں یہ مکمل غزل موجود ہے۔

(زہرا داؤدی)

زہرا داؤدی کی نذر

میرے لئے یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ مجھے زہرا داؤدی صاحبہ کی کتاب کا مسودہ اس وقت پڑھنے کو مل گیا، جب وہ کتابت میں تھا۔ مجھے مصنّفہ سے ملاقات کا شرف تو حاصل نہیں، لیکن میں نے ان کا نام بارہا سنا تھا۔ خاص طور پر اُن دنوں جب بہتر حالات کار کے لئے کالج کے اساتذہ کی تحریک چل رہی تھی۔ سابق صدر ایوب خان کے "دورِ سلطنت" میں ان کے جاہ و جلال کو للکارنے والوں میں زہرا داؤدی بھی شامل تھیں۔

زہرا داؤدی صاحبہ صرف پیشے کے اعتبار سے نہیں بلکہ اپنے عقیدے اور عمل بلکہ سارے وجود کے ساتھ ایک سچی کھری معلّمہ ہیں، پیشے سے تعلق تو غالباً باقی نہیں رہا، کیونکہ جنرل ضیاء الحق کی حکومت میں انہیں کالج کی ملازمت سے برطرف کر دیا گیا تھا لیکن وہ ایسی ہستی ہیں جو اپنے مزاج کی سادگی، کردار کی پختگی، راست گوئی اور سچے سماجی اور سیاسی شعور کی بنا پر اسی طرح لائق احترام ہیں جس طرح ایک مثالی استاد کو ہونا چاہئے۔ مجھے ان کی تحریر سے زیادہ اُن کی زندگی نے متاثر کیا ہے۔

لیکن زہرا داؤدی صاحبہ کی تحریر بھی لطف بیان کے جوہر سے خالی نہیں۔ انہوں نے یورپ برطانیہ، کنیڈا اور امریکہ کی محض سیاحت نہیں کی، بلکہ ان ملکوں میں چندے قیام کر کے وہاں کی سماجی صورتِ حال خصوصاً طبقہ نسواں کے حالاتِ زندگی کا قریب سے مطالعہ کیا ہے اور اپنے مشاہدات ناقدانہ انداز میں بیان کئے ہیں۔ وہ طبعاً ایک مشرقی خاتون ہیں، لیکن اب ایسی بھی نہیں کہ مغرب والوں کی ہر بات پر ناک بھوں چڑھائیں، انہوں نے مغربی لوگوں خصوصاً اُن کے تعلیم یافتہ مردوں اور عورتوں کی انسان دوستی، خلق و مروّت اور وعدے اور وقت کی پابندی کو بہت سراہا ہے البتہ عورتوں

کی جنسی آزادی کی مثالوں نے انہیں بہت آزردہ کیا۔ جس کا تذکرہ انہوں نے اپنی کتاب میں جابجا کیا ہے۔ ان کی تحریر کو پڑھ کر میرے ذہن میں ایک ایسی خاتون کا تصور آتا ہے جنہیں زمانے نے شدائد اور مصائب تو دئے، لیکن ان کی خود اعتمادی، خلق دوستی، ان کی رجائیت اور خوش دلی اور اس جرأت کو، جو اپنے آپ پر ہنس لینے کے لئے درکار ہے۔ پسپا نہیں ہونے دیا۔ یہ کتاب بہت مختصر ہے، جی چاہتا ہے، وہ کچھ وقت نکال کر اس سے زیادہ لکھیں۔

حسن عابدی

۳ جنوری ۱۹۸۹ء

کچھ اپنے بارے میں

اس کتاب کی ترتیب و تدوین کے بعد سب سے مشکل مرحلہ جو پیش آیا وہ تھا قارئین کے سامنے اپنا تعارف کرانا۔ اپنی ذات سے متعلق انسان بہت سے بھرم اور خوش فہمیوں میں مبتلا رہتا ہے دوست احباب تعارف کرائیں تو ان خوش فہمیوں میں خوش آئند اضافہ ہو جاتا ہے ورنہ من آنم کہ من دانم کا کرب شدید تر۔ بہر حال چونکہ روایت سی ہے کہ وہ لکھنے والے جو زیادہ جانے بوجھے نہیں ہیں۔ اپنا تعارف قارئین سے کرائیں اور چونکہ ہر روایت پامال کیے جانے کے لیے نہیں ہوتی اسلئے مختصراً کچھ اپنے بارے میں عرض ہے۔ نسبی اور نسبتی لحاظ سے صوبہ بہار کے دو ممتاز تعلیم یافتہ اور سیاسی طور پہ باشعور گھرانوں سے میرا تعلق ہے۔ مولانا علی اصغر صاحب کی بیٹی اور مولانا شفیع داؤدی صاحب کی بہو ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ڈگری کے پیمانہ پر تعلیمی استعداد جانچیں تو ایم اے (پولٹیکل سائنس) اور ایل ایل بی ہوں۔ علمی استعداد کے پیمانہ کے لیے لوگوں کی تصانیف سند کے طور پر کام آتی ہیں لیکن میرے پاس چند اردو اور انگریزی میں شائع شدہ مضامین کے علاوہ کوئی کتاب نہیں جو سند کا کام دے سکے۔

بائیں بازو کا نظریہ اور سیاست ورثے میں ملی اور ساری زندگی اس ورثے کا اجر یا حشر کی پرواہ کیے بغیر دامے درمے سخنے تحفظ کرتے رہے۔ انڈیا میں اسی سلسلہ میں جیل یاترا اور پاکستان میں کالج ٹیچرز کے مطالبات کی حمایت میں تادم مرگ بھوک ہڑتال ایک ہفتہ کی ایوب خان کے آخری دور میں کی۔ چونکہ سیاست کے داؤ پیچ کبھی نہ آئے اس لیے موقعہ ملنے کے باوجود کوئی مفاد تو حاصل نہ کر سکے لیکن بائیں بازو کے نظریات سے ذہنی اور جذباتی وابستگی کی بنا پر بیک جنبشِ قلم ۱۹۷۹ء میں نوکری سے ہٹا دیئے گئے۔ ایک تو طبیعت سرکش، اس پر کچھ مجبوریاں۔ قانونی چارہ جوئی جس کے بارآور ہونے کے امکانات (اس سیاہ دور میں) کم ہی تھے نہ کر سکے اور یوں مارشل لا کے دورِ اقتدار میں اس حاکم کی پالیسی کے تحت جو اسلامی قوانین اور انصاف کے نفاذ کا دعویٰ کرتا تھا۔ ایک عورت کو جس کا شوہر بہت پہلے زندگی سے منہ موڑ چکا تھا بلا کسی جرم و جواز کے اپنے ذریعہ معاش سے محروم کر دیا گیا۔

سیاسی سماجی اور انسانی مساوات اور انصاف کے نظریات سے ذہنی وابستگی اور پیار ہو تو انسان ہمت نہیں ہار سکتا۔ چنانچہ جب کالج سے درس و تدریس کا سلسلہ جبری طور پر ختم کر دیا

گیا تو سارا وقت بلکہ ساری زندگی عورتوں کے مسائل ان کا مطالعہ تجزیہ اور ان کے انسانی وقار و منصب کے حصول کی جدوجہد کے لیے وقف کر دی۔

پیشِ نظر کتاب اسی جدوجہد کا ایک حصہ ہے۔ اس میں آپ کو کوئی علمی اور ادبی ذخیرہ نہیں ملے گا۔ سماجی اور معاشرتی مسائل خصوصاً عورتوں کی تحریک آزادی سے متعلق میرے تجربات مشاہدات اور مطالعہ کا نچوڑ میں نے یہاں یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ پچھلے بارہ چودہ سالوں میں، میں نے بہت سارے مغربی ممالک کی سیاحت کی ہے۔ میرا بنیادی مقصد اور دلچسپی ہمیشہ یہ رہی کہ میں دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں عورتوں کی تحریکِ نجات و آزادی کی غرض و غایت اور موجودہ رجحان کو سمجھ سکوں اور ان کی خوبیوں سے سبق حاصل کر کے اور خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کر کے اپنے ملک کی ابھرتی ہوئی تحریکِ نسواں کو وہاں کے خطرات سے آگاہ کر سکوں میرے خیال میں حق و انصاف کے حصول کی ہر تحریک مثبت ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی ایک خاص موڑ پر کچھ منفی عناصر اس میں داخل ہو جاتے ہیں اور یہیں پر چوکنا ہونے کی ضرورت ہے میں نے اس کتاب میں عمومی طور پر مغرب کی خواتین تحریک اور اس کے موجودہ رجحانات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کی اس تحریک کو میں نے سراہا بھی ہے اور اس کے بعض جدید منفی رجحانات کو ہدفِ تنقید بھی بنایا ہے لیکن سراہنے کا یہ مطلب نہیں کہ میں مغرب زدہ ہوں اور تنقید کا یہ نشا نہیں کہ عورتوں کو درجہ دوم کا انسان بنائے رکھنے کی حمایت کروں۔ میری تنقید اور توصیف کا مقصد یہ ہے کہ معاشرہ کے افراد مرد و زن ایک متوازن اصول اور راہ زندگی اپنا سکیں۔ اس توازن میں کجرویاں تو ہوں کہ یہ فطرت انسانی ہے لیکن ایسی کھائیاں نہ ہوں جن میں گر کر انسانیت دم توڑ دے اور حیوانی معاشرہ باقی رہ جائے۔ اگر کتاب ختم کرتے ہوئے ایک بھی قاری کے دل میں، میں یہ تاثر چھوڑ سکوں تو یہ میری خوش قسمتی اور کتاب کی کامیابی ہوگی۔؎

تو دانی حساب کم و بیش را　　　　سپردم بتو مایہ خویش را

اگر یہ کتاب لوگوں نے پسند کی تو عزیزہ روشن سبطین (پاکستان کی معروف ہونہار افسانہ نگار) داد کی مستحق ہیں کہ انہوں نے یہ مضامین وقتاً فوقتاً پڑھ کر انہیں کتابی شکل میں چھپوانے کے لیے اس قدر اصرار کیا کہ آخر کار مجھے ہار ماننی ہی پڑی۔

میں اپنے بچوں تنویر جاوید ناہید ندیم کی بھی ممنون ہوں۔ ان کے پاپا حبیب داؤدی کی ہمت افزائی نے مجھے گھر اور بچوں کی ذمہ داریوں کے باوجود تعلیم جاری رکھنے کا جذبہ اور لگن بخشی اور دونوں بچوں نے ایک مقصد کے تحت زندگی گزارنے میں میری مدد کی اور مجھے قدم قدم پر حوصلہ دلایا کہ میں اپنے تجربات اور خیالات محفوظ کر جاؤں کہ یہ ورثہ انہیں بہت عزیز رہے گا۔

زہرا داؤدی

اکتوبر ۱۹۷۴ء میں برصغیر سے باہر جانے کا موقعہ ملا۔ چونکہ بیرون ملک جانیکا (اگر ہندوستان سے پاکستان آنے کو بیرون ملک سفر میں شمار نہ کیا جائے) یہ پہلا اتفاق تھا اس لئے اس قسم کے سفر کے آداب سے بھی مجھے واقفیت نہ تھی۔ میرا ہوائی ٹکٹ جو میرے بیٹا تنویر نے ہالینڈ سے بھیجا تھا وہ اسلام آباد سے ایمسٹرڈم تک کا تھا۔ اس لئے مجھے کراچی سے اسلام آباد اندرونی فلائٹ سے جانا پڑا۔ اتفاق سے ہوائی جہاز کا بھی یہ پہلا ہی سفر تھا۔ خیر اسلام آباد کے ہوائی اڈہ پر اُتر کر اِدھر اُدھر سے پوچھ تاچھ کر کے اپنا سامان وغیرہ بُک کرایا اور خدا کا شکر ہے کہ صحیح ہوائی جہاز پر ہی سوار ہوئے۔ کنارے کی سیٹ یعنی کھڑکی سے لگی ہوئی مجھے ملی تھی، بیٹھ کر نہایت ہی اطمینان کا سانس لیا اور باہر کے نظارے سے جہاز کی پرواز سے قبل اسلام آباد ہی میں لطف اندوز ہونا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد اعلان ہوا کہ مسافر اپنا اپنا سامان شناخت کریں۔ ہم نے بھی شناخت کرنے کے لئے اپنی سیٹ پر بیٹھے ہی بیٹھے باہر نگاہ دوڑائی۔ میرا نیا خریدا ہوا سبز رنگ کا سوٹ کیس سامنے ہی سامان کے ڈھیر میں پڑا نظر آیا۔ چونکہ پہلے پہلے ہوائی سفر کے لئے نیا نویلا سوٹ کیس خریدا تھا اسلیئے اسکے دوسرے سامان میں گھل مل جانے کا امکان ہی نہ تھا۔ بہر حال

مطمئن ہوکر ہم نے بڑے اطمینان کی سانس لی۔ میں نے اپنا سامان بڑی آسانی سے شناخت کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد اعلان ہوا اور پے درپے کئی منٹ تک ہوتا رہا کہ ایک سوٹ کیس کی شناخت اب تک نہیں ہوئی ہے اور مسافر مہربانی کر کے اسے شناخت کریں۔ ہم نے دل ہی دل میں بڑی شانِ بے نیازی کے ساتھ اپنے آپ کو داد دی کہ دیکھو میں نے اپنے پہلے ہی ہوائی سفر میں فوراً ہی اپنا سوٹ کیس پہچان لیا۔ پتہ نہیں یہ کونسا بیوقوف مسافر ہے جو ابتک اپنے سامان کی شناخت ہی نہیں کر پا رہا ہے۔ مجھے یہ بھی خدشہ لگا ہوا تھا کہ کہیں اس ایک مسافر کی بیوقوفی کی وجہ سے جہاز کی اڑان میں دیر نہ ہو جائے، خیر صاحب خدا خدا کر کے اعلان ختم ہوا اور کیپٹن نے جہاز کی پرواز شروع ہونے کا اعلان کیا۔ جہاز آہستہ آہستہ زمین سے رینگنے لگا اور مجھ پر بجلی تو جب گری جب ہم نے سرکتے ہوئے جہاز کی کھڑکی سے دیکھا کہ سارا سامان تو جہاز پر لاد دیا گیا ہے لیکن میرا اکلوتا نیا ہرے رنگ کا سوٹ کیس ٹرالی پر خراماں خراماں واپس لے جایا جا رہا ہے۔ یہ منظر ظاہر ہے میرے لئے بڑا روح فرسا تھا۔ اب صاحب ہم دوڑے جہاز کے اسٹیورڈ کے پاس کہ ارے روکو روکو میرا سوٹ کیس رہ گیا ہے۔ اسٹیورڈ نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا گویا مجھ سے زیادہ نادان اس سرزمین پر دوسری مخلوق نہ ہو اور بڑے ترش لہجہ میں کہا کہ اب کیا ہو سکتا ہے۔ آپ نے اپنے سامان کی نشان دہی کیوں نہ کی تھی۔ اب ہم ہزار اسے سمجھائیں کہ اعلان ہوتے ہی ہم نے اپنا سامان دیکھ کر پہچان لیا تھا مگر نہ تو اس کی سمجھ میں بات آئی نہ ہی اس نے جہاز رکوانے کے لئے کوئی بھاگ دوڑ کی۔ ناچار ہم واپس آ کر اپنی نشست پر بیٹھ گئے اور اس حادثہ کے واقع ہونے کی منطق پر غور کرنا شروع کیا۔ قبل اس کے کہ جہاز بادلوں کی وسعت کو چھوتا یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ مجھے شناخت کر کے خود سے جہاز

کے عملہ سے سامان پر شناختی نشان لگوانا چاہیئے تھا کہ اسلام آباد کے ائرپورٹ اور شاید کچھ اور ایئرپورٹ کا بھی دستور یہی ہے۔ اس بات کا سخت ملال ہوا کہ وقت ہاتھ سے نکل جانے کے پہلے ہی اتنا غور و خوض اس مسئلہ کی باریکی پر کر لیا ہوتا تو کاہے کو اپنے نئے ہرے رنگ کے سوٹ کیس سے ہاتھ دھونا پڑتا کہ ایک خدشہ یہ بھی تو لگا ہوا تھا کہ کہیں ہوائی سفر کا یہ بھی دستور نہ ہو کہ شناخت نہ کرنے کی صورت میں سامان بحق ہوائی کمپنی ضبط ... خیر اب کر بھی کیا سکتے تھے سوائے اس کے کہ یہ سمجھ کر صبر کر لیں کہ اس سوٹ کیس کا اور میرا ساتھ محض دو ہی دنوں کا ساتھ تھا جبکہ ہم نے اسے اپنے پہلے پہل کے ہوائی سفر کے لئے بڑے چاؤ سے خریدا تھا۔ سو اگر خدا کی مرضی یوں تھی تو یوں ہی سہی۔ بندہ کا کیا دخل، ہم نے تو اپنی ناواقفیت کی بنا، پر یہ سمجھا تھا کہ کسٹم کرا کے ہم نے اپنا سامان ایسے نگہبانوں کے سپرد کیا تھا جو اسے منزل تک پہنچا کر ہی دم لیں گے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ آخری لمحہ تک جہاز میں سوار کرانا بھی میرا ہی کام تھا۔

بچپن میں سمجھتے تھے کہ بادل آسمان میں سٹا ہوا ہوتا ہے۔ خیر جب ذرا بڑے ہوئے تو یہ تصور تو جاتا رہا کیوں کہ اب یہ معلوم ہو چکا تھا کہ آسمان کی وسعت اور بلندی لامحدود ہے اور بادل محض فضا میں تیرتے ہیں لیکن یہ اتنے حسین بھی ہو سکتے ہیں اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب جہاز نے بلندی پر پرواز کی اور بادلوں کی حدود سے پرے ہو گیا۔ کبھی لگتا تھا کہ روئی کے شفاف گالوں کے درمیان بہتے چلے جا رہے ہیں اور کائنات میں سورج اور چاند کا کہیں وجود ہی نہیں ہے کہ یکدم سے طیارہ پستی کی جانب آ رہتا اور سورج کی کرنیں گل کھلانے لگتیں مانو یہ بات اسے بری لگی کہ اس کے وجود پر شک کیا جائے۔ لو ابھی ابھی آفتاب عالمتاب اپنی پوری جلوہ گری کے ساتھ ضو فگن تھا کہ یکایک رات کی

تاریکی نے ساری کائنات کو لپیٹ میں لے لیا اور چاند کا دمکتا ہوا بظاہر بے داغ چہرہ نمودار، ایک لمحہ کو تو ہم سوچ میں پڑ گئے کہ یہ فلک کی کج رفتاری ہے یا ہمارے طیارے کی۔ مگر جب جہاز پر اعلان ہوا کہ اب ایمسٹرڈم کا ائرپورٹ آیا ہی چاہتا ہے تو پتہ چلا کہ اب وقت تقریباً پانچ یا چھ گھنٹے پیچھے چلا گیا ہے۔ جی ہاں وہی وقت جس سے اقبال نے التجا کی تھی کہ "لوٹ اے گردش ایام لوٹ" سو اقبال تو وقت کے قدموں کو ایک منٹ بھی پیچھے نہ ہٹا سکے تھے مگر ہمارے طیارے نے یہ کارکردگی بخیر و خوبی کر دکھائی اور اسے چھ گھنٹہ پیچھے دھکیل کر ایمسٹرڈم ائرپورٹ پر سارے مسافروں سمیت پہنچ گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ دس بارہ گھنٹہ کا یہ راستہ کیسے طے ہوا۔ نہ صرف یہ کہ پتہ نہ چلا بلکہ مجھ پر تو کچھ بے خودی اور کچھ کھلی کائنات کے حسن اور دبدبہ کی وجہ سے عالم جذب کی سی کیفیت طاری رہی۔ کہیں میرے قارئین یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ آج بھی میں اتنی ہی سادہ لوح ہوں اور ہوائی سفر میرے لئے اب بھی اتنا ہی دلکش اور مسحور کن۔ جی نہیں، اب کافی تجربہ ہو چکا ہے۔ اب تو سفر کے لئے دل وہی پرانے طرز کی ریل گاڑی مانگتا ہے جو چھک چھک کرتی تیس میل کی رفتار سے چلی جارہی ہو۔ ہر اسٹیشن پہ دھکا پیل بھاگ دوڑ اور قلیوں اور پھیری والوں کی چیخ و پکار ہو اور جہاں مٹی کے کوزے میں گرم چائے اور ٹھنڈا پانی ملتا ہو اور کبھی کبھی یہ چائے اور پانی مشرف با اسلام ہو یا شدھی کرا کے ہندو ہو گئی ہو۔

جب ہم ایمسٹرڈم کے ائیرپورٹ پر کسٹم کرانے کے لئے گئے تو کوئی شخص انگریزی یا تو سمجھنے والا نہ تھا یا سمجھنے کے لئے تیار نہ تھا اور ہم اس زعم میں یہاں تک آ پہنچے تھے کہ انگلش جیسی بین الاقوامی زبان پر بخیال خویش عبور رکھتے ہیں ہمیں کیا مشکل ہو گی۔ خیر اشاروں کی بین الاقوامی زبان میں بات کرنے پر پتہ چلا کہ ملک میں داخلہ

کے لئے وہ لوگ ویزا مانگ رہے ہیں اور ہمارے پاس ویزا نام کی کسی چیز کا سرے سے نام و نشان بھی نہ تھا۔ ظاہر ہے اب واپس جانے کا تو سوال ہی نہیں تھا بڑی مشکلوں سے اپنا مطلب واضح کیا کہ میرا بیٹا میرا داخلہ کا پرمٹ لے کر باہر میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کر کے اسے بلاؤ۔ ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے محترمہ چلی ہیں یورپ کی سیاحت کرنے اور مکمل انحصار ہے بیٹا کی عقل و دور اندیشی پر۔ ایک دفعہ جی دھک سے رہ گیا۔ کیا واقعی عورت زندگی کے ہر دور میں ہر قدم اٹھانے کے لیے مرد کی محتاج ہے مگر مجھ سے ایسی غلطی سرزد ہوئی کیوں کہ میں تو عورتوں کے حقوق، وقار، فرائض اور منصب کی زبردست علمبردار ہوں بلکہ یوں کہنا زیادہ بیجا نہ ہوگا کہ اسی مساوات کو میں نے اپنا جزو ایمان اور منزل حیات بنا رکھی ہے۔ مگر اب تو اپنے مشن کو بھول کر مرد بیٹیا کا سہارا لینا ہی تھا۔ سو جیسے ہی تنویر لاؤڈ اسپیکر کے اعلان پر اندر آیا اسے دیکھتے ہی چہرے کی ہوائیاں ہوا ہوگئیں تنویر اپنا پاسپورٹ اور ورک پرمٹ ساتھ لائے تھے۔ مجھے تو انہوں نے آرام سے ایک طرف بٹھا دیا اور کافی ردوکد کے بعد میرے لئے ملک میں داخل ہونے کا ویزا حاصل کیا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ہم لوگ باہر آگئے۔ وہیں ہم نے اپنے ہرے رنگ کے سوٹ کیس کی داستان جگر پاش سنائی۔ دیکھا کہ پریشان بالکل نہ ہوئے بولے ابھی یہیں سے اسلام آباد TELEX کر دیتے ہیں سامان آجائے گا فوراً میں نے سوچا کہ ارے یہ TELEX تو ہم بھی دے سکتے تھے اس میں مرد کی کیا ضرورت تھی۔ مگر صرف سوچ کر ہی رہ گئے۔ بہرحال کراچی TELEX کرا دیا گیا اور ائرپورٹ کے منتظمین نے وعدہ کیا کہ سامان دوسری فلائٹ سے آجائے گا اور واقعی دوسری فلائٹ سے سامان بخیریت واپس آگیا۔

شام ہو چلی تھی اور تنویر کا گھر ائرپورٹ سے کافی دور تھا۔ پھر بھی راستہ بھر

کار سے شہر کا نظارہ کرتے رہے اور پہلا تاثر جو آخری بھی ثابت ہوا وہ یہ تھا کہ ہالینڈ بہت خوبصورت اور بے انتہا صاف ستھرا ملک ہے۔ جب ہم نے انڈیا سے پاکستان نقل مکانی نہیں کی تھی تو گھوم پھر کر اندرون ملک تفریحی یا پہاڑی مقامات پر جایا کرتے تھے تو محسوس ہوتا تھا کہ دلکشی اور حسن یہاں پر ختم ہے۔ جمشید پور ایک چھوٹا سا صنعتی شہر ہے لیکن وہ مجھے بہت خوبصورت گڑیا کے گھروندے کی مانند لگتا تھا۔ ظاہر ہے کہاں ایمسٹرڈم اور کہاں جمشید پور، بہار کا ایک صنعتی شہر لیکن ہالینڈ آکر جب اس کی خوبصورتی اور دلکشی سے ہم متاثر ہوئے تو جھٹ دل نے جمشید پور سے موازنہ کر ڈالا اور ... (مہربانی کر کے محترم قارئین میری ہنسی نہ اڑائیں) ہالینڈ تو اچھا ضرور لگا لیکن جمشید پور آنکھوں سے اوجھل ہونے کے باوجود زیادہ دل کو بھایا ویسے بھی جو چیز ماضی کا حصہ بن جائے حال سے زیادہ حسین نظر آتی ہے۔ خیر جانے کہاں بہک گئے۔ تو ہم کہہ رہے تھے کہ ہالینڈ کے وہ حصے اور علاقے جو جنگِ عظیم دوم کے بعد تعمیر کئے گئے ہیں وہ خصوصی طور پر سیاح سے دادِ حسن وصول کرتے ہیں اور پھول اور باغات اور چمن آرائی ناقابلِ بیان حسن رکھتے ہیں۔

گھر پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی تھی۔ کافی دیر تک ہم تینوں یعنی ہم تنویر اور عفت گپ کرتے رہے۔ گھر کی باتیں، میرے مسائل کی باتیں اور یہ کہ امی آپ اب کراچی چھوڑ کر ہم لوگوں کے پاس آجائیں۔ اب آپ کے بیٹا بڑے ہو گئے۔ آپ کو اب روزی روٹی کے چکر میں اب پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹا کی محبت، شفقت جذبہ اور احساس ذمہ داری کی داد دینے کے علاوہ میں جذباتی طور پر بھی بہت متاثر ہوئی لیکن اس کی معصومیت پر ہنسی بھی آئی۔ ابھی ابھی بیچارے کا پشاور یونیورسٹی سے رزلٹ آیا تھا۔ ساتھ ہی سر ہو کر میں نے شادی بھی کر دی تھی۔ پائی پائی جوڑ کر کسی باہر کی یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے لیے سرگرداں تھے۔ دوسرے تینوں

بھائی یعنی جاوید ناہید ندیم چند ماہ پیشتر امریکہ جا چکے تھے اور بڑی جد و جہد کر رہے تھے۔ ایسے میں بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم بھی ان لوگوں کے پاس آ رہتے۔ جاوید ناہید ندیم سے اسی وقت فون پر تنویر نے بات کرا دی۔ ندیم (میرا سب سے چھوٹا بیٹا جس کی عمر اس وقت صرف سترہ سال تھی) ٹیلیفون پر میری آواز سن کر مچل گیا "امی آپ اسی وقت میرے پاس آ جائیں" باتوں کا امرت ٹپکا ٹپکا کر اسے ڈھارس بندھائی۔

عفت نے بریانی اور قورمہ میری ضیافت کے لیے بنایا تھا اور پانی کی جگہ کوک کی ٹھنڈی بوتل۔ ہاں یہ بتاتے چلیں کہ ہم جتنے دن ہالینڈ میں رہے۔ ٹھنڈا شفاف پانی پینے کے لیے ترس گئے۔ وہاں کے لوگ پانی کی جگہ بیئر اور ہماری طرف کے لڑکے جو بیئر سے احتراز کرتے ہیں وہ کوک وغیرہ قسم کا مشروب پیتے ہیں کہ وہاں کا سادہ پانی نقصان کرتا ہے۔

ہلکی سردی تھی اور مکان گرم رکھنے کا مرکزی نظام نہ تھا اس لیے بجلی کا ہیٹر آن کر کے قریب تین بجے ہم تینوں پردیسیوں کی محفل برخاست ہوئی اور سونے کے پروگرام پر عمل شروع ہوا۔ دوسرے روز اتوار تھا اور شہر دیکھنے کا پروگرام۔ میرے لئے تہذیبی اور جغرافیائی نقطہ نظر سے دنیا دیکھنے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ اس لیے اچھا خاصا اشتیاق تھا۔ ساتھ ہی تھکان بھی تھی۔ اس لیے بستر پر پڑتے ہی سو گئے۔ رات بھر خواب میں بادلوں کے اوپر پرواز کرتے رہے خاص طور پر وہ منظر بار بار مسحور کرتا رہا جب سورج بادل کے اوپر جلوہ فگن تھا اور نیچے اس کی کرنوں کے طفیل سونے کا سمندر۔

ہالینڈ کی پہلی صبح

رات کو میں کتنی دیر کرکے بھی سوؤں صبح اُٹھنے کی عادت ہے۔ ابھی رات کے اندھیرے نے صبح کے اجالا سے ہم آغوش ہونا شروع کیا ہی تھا کہ ہم اٹھ بیٹھے مکان کے پیچھے چھوٹا سا باغیچہ تھا اور سمر ہاؤس قسم کی چیز بنی ہوئی تھی ہم نے یہاں کی صبح اور اس کی لطافت سے لطف اندوز ہونے کا فیصلہ کیا اور باغ کے رُخ کا دروازہ کھولا تو سامنے سمر ہاؤس کی چھت پر ایک بلی بیٹھی نظر آئی۔ ابھی ہم اس بات پر بحرِ حیرت میں غوطہ کھا ہی رہے تھے کہ سفید فاموں کے اس دیس میں بھی بلی بالکل ہمارے یہاں کی جیسی تھی کہ اس نے ایک زور سے میاؤں کی۔ لو یہ تو اسی طرح اردو میں میاؤں کرتی ہے جیسے ہمارے ہاں کی بلیاں کرتی ہیں۔ یا اللہ کیا اب یہ بلیاں ہی ہمارے مشن کو بین الاقوامی سطح پر تکمیل تک پہنچائیں گی۔ ساری کوششوں کے باوجود ہندوستان میں ہم اسے دوسری قومی زبان کا درجہ نہ دلا سکے۔ پورے پاکستان کی قومی زبان بنانے پر آئے تو آدھا پاکستان گنوا بیٹھے اور ابھی بھی باقی ماندہ پاکستان میں اردو بچاری جہد البقا میں لگی ہوئی ہے۔ لگتا ہے بلیوں کی میاؤں کے ذریعہ یہ زبان دنیا میں چھا جائے گی۔ بہت دل خوش ہوا۔ بے ساختہ جی چاہا کہ بلی کو اٹھا کر سینے سے لگالیں۔ مگر چونکہ بچپن سے آج تک بلیوں سے ڈرتے آئے ہیں۔ اس لیے اس ارادہ سے باز رہے۔ تنویر اور عفت سو کر اُٹھے تو بلی کی اردو میں میاؤں کرنے کی بات ہم نے ان کو سنائی۔ ”امی جانوروں کی زبان ساری دنیا میں ایک ہی ہوتی ہے خواہ ان کی نسل اور ان کا وطن کچھ بھی اور کہیں بھی ہو۔“

”ارے واہ تو جانوروں میں لسانی جھگڑے کی بنیاد پر آپس میں خون خرابہ

بھی نہیں ہوتا ہوگا۔" ہم نے دل ہی دل میں سوچا کیوں کہ ایسے خیالات کا اظہار کرنا بیوقوفی ہوتی اور وہ بھی مغرب کے ایک ملک میں مگر جی میں ایک انہونی سی تمنا نے کروٹ لی۔ کاش کہ ساری دنیا میں انسانوں کی زبان بھی ایک ہی ہوتی تو شائد ان کا مفاد بھی ایک ہی ہوتا تو شاید جنگیں نہ ہوتیں تو شاید انسان انسان کے خون کا پیاسا نہ ہوتا تو شاید انسان ایک دوسرے کا استحصال نہ کرتا ..." توبہ کرو اس شاید کا کہیں خاتمہ بھی ہوگا؟ کہاں کھوگئیں امی کراچی یاد آرہا ہے۔ مجھے غائب دیکھ کر بیٹا فکر مند ہوگیا۔

تنویر کے ڈچ دوست

یوروپین کو کتے بہت پسند ہیں اور وہ انہیں بہت پیار کرتے ہیں۔ یہ تو پتہ تھا مگر اس پیار کی گہرائی کا اندازہ نہ تھا اور ہم جنس اور غیر جنس کی بات تو خیر چھوڑ دیجیے جانوروں سے یونہی خوف کھاتے ہیں چاہے وہ کتا ہو، بلی ہو یا چڑیا۔ اس شام تنویر نے ایک ڈچ جوڑے کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا تھا۔ میں چونکہ پہلی بار باہر گئی تھی اس لیے وہاں کے مقامی لوگوں سے ملنے کا اور انھیں سمجھنے پرکھنے کا مجھے بہت شوق تھا۔ تنویر نے ہم سے پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ امی یہاں لوگ کتا اپنے ساتھ لاتے ہیں اور اگر ان کے کتوں کو پیار نہ کیا جائے تو میزبان کو سخت بداخلاق سمجھتے ہیں۔ اس لیے آپ دل پر جبر کر کے ہی سہی مگر میرے دوست کو خوش کرنے کے لیے اس کے کتے کی پیٹھ ضرور تھپتھپا دیجیے گا۔ اس کو خوش کرنے کے لیے تو نہیں مگر بیٹا کو خوش کرنے کے لیے ہم نے وعدہ اور ارادہ دونوں ہی کر لیا کہ آج اس ڈچ جوڑے کے کتے کو ضرور پیار کریں گے۔ ٹھیک وقت پر دونوں آپہنچے کتا تو ساتھ نہ تھا۔ ہاں بے بی

کیرئیر میں بچہ ضرور تھا۔ سو رہا تھا اور بڑا خوبصورت سا شال سر سے پاؤں تک اوڑھے ہوئے۔ خدا کا تہہ دل سے شکر ادا کیا جس نے اپنی لازوال مہربانیوں کے صدقے اس جان لیوا آزمائش سے مجھے بچا لیا اور کتے کو پیار کرنے کی مصیبت سے نجات ملی۔ تعارف ہوا اور بڑے خوش خوش ہم لوگ صوفہ پر بیٹھے بے بی کیرئیر صوفہ کے ساتھ ہی ان کے نزدیک رکھ دیا گیا۔ بچہ سو رہا تھا تھوڑی دیر میں بچہ شال کے اندر کلبلایا تو ہماری معزز مہمان نے اپنے ہینڈ بیگ سے اس کے دودھ کی بوتل نکالی اور بچہ کے منہ میں لگا دی۔ مگر یہ کیا! بچہ کا منہ تو بالکل کتے جیسے تھا۔ خیر ہم نے کلیجہ تھاما ہی تھا کہ نونہال کتا غرا کر میری جانب لپکا۔ شاید اسے میرے کلیجہ تھامنے کا اندازہ ہو گیا تھا ہم سارے وعدہ، ارادہ اور تہذیب گویا ایک دم بھول گئے اور جان بچانے کی سعی میں اچھل کر دونوں پیر اوپر چڑھا کر کھانے کی میز پر جو اب تک انواع اقسام کی ڈشز سے سجی جا چکی تھی بیٹھ گئے۔ یہ سب کچھ ایک لمحہ میں ہو گیا۔ کیوں کہ کتے کے مالک یا منہ بولے والدین نے فوراً اسے گود میں اٹھا کر پیار چمکار کر قابو میں کر لیا۔ اتنے میں ہمارے حواس بھی بجا ہو چکے تھے۔ سو ہم بھی انتہائی شرمندگی کے عالم میں اس کھانے کی ٹیبل سے اترے جو اب ٹوٹنے والی ہی تھی اور بڑے اخلاق اور پُرسوز خلوص کے ساتھ معزز مہمانوں سے اپنی بدتمیزی کی معافی مانگی ظاہر ہے یہی کہنا تھا کہ میں کتے سے ڈر کر نہیں بھاگی تھی بلکہ مجھے اکثر اس طرح کا دورہ پڑ جاتا ہے اور یہ کہ ماشاءاللہ آپ کا لاڈلا کتا بہت ہی پیارا اور ہونہار بچہ ہے خدا اِسے نظرِ بد سے بچائے۔ اگرچہ اندر سے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے مگر کتے کو ہم نے ہلکے پھلکے پیار بھی کیا۔ بیچارے تنویر کو بڑی شرمندگی اپنے گورے دوست کے سامنے اٹھانی پڑی۔ مگر میرے "مرگی کے

مرض" نے بہت کچھ حالات کو سنبھال لیا۔

ایک قدامت پرست ڈچ لڑکی سے ملاقات

تنویر کی شادی کی پہلی سالگرہ ہوئی اس موقعہ پر انہوں نے کچھ لوگوں کو اپنے یہاں مدعو کیا تھا۔ اچھا خاصا خوبصورت سا فنکشن رہا اور اجتماع بھی بین الاقوامی قسم کا ہو گیا تھا۔ ہندوستانی، پاکستانی، بنگلہ دیشی، ہورنامی اور مقامی ہر طرح کے افراد تھے۔ کھانا ہم نے اور عفت نے مل کر بنایا اور لڑکوں نے مزے لے لے کر کھایا۔ کھانے کے فوراً ہی بعد ایک ڈچ لڑکی جو عفت ہی کے آفس میں کام کرتی تھی۔ اس نے جانے کی جلدی شروع کی۔ ہم کو تو ہالینڈ کا ملک اور شہر دیکھنے سے زیادہ دلچسپی وہاں کے مقامی لوگوں سے ملنے اور ان کے رسم و رواج اور طور طریقوں میں تھی۔ چنانچہ ہم اس ڈچ لڑکی سے دیر تک مختلف سماجی موضوعات پر بات کرتے رہے۔ نزدیک ہی میں وہ رہتی تھی۔ ہم نے کہا کہ بھئی تمہارا جانا تو کوئی مشکل نہیں ہے چند قدم کے فاصلہ پر تم رہتی ہو اور اس کا جواب سن کر ہم اچنبھے میں پڑ گئے۔ بھلا مغرب میں بھی لڑکیوں پر یہ پابندی ہوتی ہے؟ مجھے اس لڑکی کا نام یاد نہیں رہا مگر اس نے مجھے بتایا کہ اس کے ابا بہت پرانے خیال کے آدمی ہیں اور لڑکیوں کا تنہا کہیں آنا جانا پسند نہیں کرتے۔ یہ تو چوں کہ عفت اسی آفس میں کام کرتی ہیں اس لیے یہاں آنے دیا اور تھوڑی دیر میں واقعی اس کے ڈیڈی اسے لینے آپہنچے لیکن اس طرح کے پرانی اقدار کے لوگ بعد میں ہمیں شاید بالکل ہی نہ ملے۔ یہ واحد لڑکی تھی جس کے گھرانے میں مجھے کچھ کچھ اپنے ملک کی دقیانوسیت کے آثار ملے ورنہ تو قدم قدم پر خرمن ہوش و حواس پر بجلی گرنے کے بے تحاشا مواقع

آئے۔ غنیمت یہ ہوا کہ میری مغرب کی پہلی سیاحت یورپ تک ہی محدود رہی کہ یورپ پھر بھی امریکہ کے مقابلہ میں بہت دقیانوسی ہے (اس حد تک کہ جب ہم پہلی بار نیویارک وغیرہ سے لندن گئے تو ایسا لگا کہ کراچی سے حیدر آباد آ گئے ہوں) جو اگر کہیں سیدھے امریکہ یا کینیڈا پہنچے ہوتے تو جانے وہاں کے لوگوں کو حالت فطرت میں دیکھ کر اپنی کیا حالت ہوتی۔

میرے رہتے ہی رہتے تنویر کا داخلہ اٹاوہ یونیورسٹی میں ہو گیا۔ میرے پروگرام میں امریکہ بھی شامل تھا لیکن مالی پریشانیاں آڑے آ گئیں اور ہمیں اپنے تینوں بیٹوں جاوید، ناہید اور ندیم کو ہالینڈ سے خدا حافظ کہنے پر اکتفا کرنا پڑا۔ بہر حال اب تنویر کو ہالینڈ چھوڑ کر جانا تھا اس لیے گھر مع سامان کے فروخت کرنے کا فیصلہ ہوا۔ کئی خریدار دیکھنے آئے۔ ان میں ایک بہت ہی کمسن نوجوان جوڑا بھی تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ کے سائنٹیفک سماجی رشتہ میں منسلک ہیں چونکہ اب انہیں اپنے والدین سے علیحدہ ہو کر آزاد و خود مختار زندگی گذارنی ہے اس لیے گھر کی تلاش میں ہیں (لڑکے اور لڑکی دونوں کی عمر اٹھارہ اور انیس سال کے درمیان تھی اور حال ہی میں قانونی طور پر بالغ ہوئے تھے) اسے میری جہالت سمجھیے یا تنگ نظری لیکن مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ باقاعدہ شادی کے پہلے ہی ڈنکے کی چوٹ یہ لوگ علیحدہ گھر بسا سکتے تھے اور ان کے خاندان اور معاشرہ کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ ہم یہ دعویٰ تو نہیں کرتے کہ ہمارے برصغیر پاک و ہند میں اقدار سے ہٹ کر اعمال نہیں ہوتے لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ اب تک مثبت اور منفی رویہ میں امتیاز ضرور برتا جاتا ہے۔

خیر تو اس جوڑے سے بہت سی امیدوں کے ساتھ ہم نے پوچھا کہ اچھا تو مکان خریدتے ہی تم لوگ شادی کر کے ماں باپ سے الگ ہو جاؤ گے؟

ان گورے بچوں نے اس پر سخت حیرت زدہ ہو کر مجھے بتایا کہ شادی کی تو ابھی ایسی کوئی جلدی نہیں ہے کیوں کہ ہمارا معاشرہ اور حکومت کافی حد تک انفرادی آزادی کا تحفظ کرتی ہے۔ جب سہولت ہو گی تو شادی کی رسم بھی ادا کر لیں گے ورنہ COMMON LAW HUSBAND AND WIFE کی حیثیت سے اور سارے قانونی اور سماجی تحفظ کے ساتھ جب تک جی چاہے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ جی جب ایک دوسرے سے بھر جائے تو طلاق کے جھنجھٹ میں جائے بغیر ہی ایک دوسرے سے الگ ہو سکتے ہیں کہ شادی ہی کب ہوئی تھی۔

ہم نے مزید معلومات حاصل کرنے کے پہلے صدمہ سے بے ہوش ہونے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے پوچھا۔ "یعنی شادی کے بغیر تم لوگ .....؟

جواب سنئے اور برداشت کی صلاحیت پیدا کیجئے۔ "جسمانی ملاپ کے لیے اگر جانوروں پر کوئی پابندی نہیں ہے تو انسانوں پر کیوں ہو کہ ہیں تو دونوں ہی جاندار اور اللہ کی مخلوق۔"

اتوار کا دن تھا۔ جلدی جلدی ہم لوگوں نے ناشتہ کیا کیونکہ ہماری پاکستانی زبان میں منڈی جانا تھا۔ ہفتہ بھر کی سبزی پھل اور دیگر ضروریات خریدنے کے لیے۔ یہ بالکل ہمارے پاکستانی ہاٹ کا نمونہ ہوتا ہے سوائے اس کے کہ صفائی ذرا زیادہ اور بیچنے والی گوری عورتیں اسکرٹ بلاوز میں۔ گھر سے یہ جگہ نزدیک ہی تھی اس لیے مارکیٹنگ تھیلے لے کر ہم چل پڑے۔ اکتوبر کا مہینہ تھا اور اتفاق سے اس روز موسم نہایت خوشگوار تھا بعد میں پتہ چلا کہ ان دنوں اکثر بارش ہوتی رہتی ہے۔

بس بالکل وہی انداز سبزی ترکاری بیچنے والوں کا جو ہمارے یہاں ہوتا ہے۔ چیزوں کا مول تول بھی ہوتا رہا۔ مچھلی بیچنے والیاں نیچے زمین پر بیٹھ کر مچھلیاں بیچ رہی تھیں اور ساتھ ساتھ اپنے مال کی تعریف بھی کرتی جا رہی تھیں۔ مچھلی بازار کا روایتی شور یہاں بھی کانوں کے پردے پھاڑے دے رہا تھا۔ ذرا اور آگے بڑھے تو میک اپ اور سنگھار کی طرح طرح کی چیزیں۔ بچوں اور بڑوں کے ریڈی میڈ کپڑے وغیرہ وغیرہ۔ گھریلو عورتیں اکثر تو بچوں کو گود میں اٹھائے اور اکثر بچہ گاڑی پر لے کر خرید و فروخت کر رہی تھیں اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ ایک ایک عورت کے ساتھ اکثر کئی کئی بچے ہوتے تھے۔ کوئی مچل رہا ہے۔ کوئی کسی چیز کی فرمائشیں کر رہا ہے۔ کوئی راستہ ہی میں اڑ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ یہاں آنے سے پہلے ہم سمجھتے تھے کہ چوں کہ ہم لوگ ترقی یافتہ ملک سے تعلق نہیں رکھتے ہیں اس لیے ابھی تک ہمارے ہاں کی عورتوں نے بچوں کی ذمہ داری سے مکمل طور پر نجات حاصل نہیں کی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ملک ہالینڈ بھی اس معاملہ میں بہت زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہے اور لوگوں کے تین تین چار چار بچے بھی ہوتے ہیں۔ چوں کہ بلی کے اردو بولنے کا علم ہو چکا تھا اس لیے گورے

بچوں کو اردو میں روتے سن کر تعجب نہیں ہوا اور دل کو اطمینان دلا لیا کہ جانوروں کی مانند بچوں کی زبان بھی ساری دنیا میں ایک ہی ہوتی ہے جبھی تو سارے بچے یکساں طور پر اپنی ماؤں کو تنگ کرتے ہیں۔ کھلونوں اور ٹافی کو پسند کرتے ہیں اور چابی کے گچھوں کو منہ میں لیتے ہیں اور جب بولنا شروع کرتے ہیں تو سب سے پہلے اوں آں اور ماما دادا کے الفاظ ہی سے آغاز کرتے ہیں۔ بس گوروں کے بچے اگر ناکام رہے ہیں تو رنگ کے معاملہ میں۔ تبھی ساری غیر جانب داری کے باوجود رنگ کی تفریق نہ مٹا پائے اور بہت گورے پیدا ہوتے ہیں اور باقی عمر بھی گورے ہی رہ جاتے ہیں۔

سرنام اب تو ایک خود مختار ریاست ہے لیکن جن دنوں ہم ہالینڈ گئے تھے یعنی ۱۹۷۴ء میں اس وقت یہ کم و بیش ڈچ نوآبادیات میں شامل تھا۔ اگرچہ جدوجہد آزادی زوروں پر تھی۔ ہمیں سرنام جانے کا موقعہ تو نہ ملا لیکن وہاں کے بہت سے ہند نژاد افراد سے ملنے کا موقعہ ملا۔ یہ لوگ اصلاً اور نسلاً ہندوستانی ہندو و مسلمان تھے مگر مذہبی اختلافات کے باوجود سماجی میل جول کی جو مثال میں نے ان لوگوں میں دیکھی اس نے میرے اس اعتقاد کو مزید تقویت دی کہ انسان مذہب کو اگر نجی زندگی تک محدود کر دے تو زیادہ بہتر مخلوق بن سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرنا بے موقع نہ ہوگا۔ تنویر (میرا بڑا لڑکا) کا ایک پاکستانی دوست جو تنویر ہی کے ساتھ ہالینڈ گیا تھا وہ ایک سرنامی مسلم خاندان میں اتنا گھلا ملا کہ اس خاندان کی ایک لڑکی اسے پسند آگئی اور اس نے اس سے شادی کرلی۔ شادی میں ہم سبھی شامل کیا ہوئے باقاعدہ بارات لے کر دلہن والوں کے گھر گئے۔ لڑکے کے بڑے بھائی لندن سے مٹھائی، سہرا اور مہندی لے کر آئے۔ ابا نے پاکستان سے دلہن کا خوب بھاری

کمخواب کا جوڑا بھیجا۔ ہم تقریباً چالیس کے قریب عورتیں مرد ملا کر بارات لے کر پہنچے تھے۔ پاکستان ایمبیسی سے نکاح پڑھانے کے لیے قاضی صاحب بلائے گئے تھے۔ لڑکی والے بذاتِ خود پاکستان کے طور طریقوں اور رسومات سے تو واقف نہ تھے مگر چونکہ دولہا نے انہیں بتا دیا تھا کہ نکاح کے وقت لڑکی دلہن بن کر گھونگھٹ نکال کر اندر بیٹھتی ہے اور باہر سے قاضی اور گواہ اس کی رضامندی لینے آتے ہیں اس لیے دلہن باہر نہ آئی۔ اس موقعہ پر تھوڑی سی بدمزگی بھی ہوتے ہوتے رہی۔ ہوا یہ کہ بھلا ہو ہمارے پاکستانی نکاح خواں حضرت کا کہ وہ اڑ گئے کہ چونکہ لڑکی پردہ نہیں کرتی اس لیے نکاح کے وقت اس کا نکاح خواں کے سامنے موجود رہنا ضروری ہے ہم سب سمجھا کر ہار گئے کہ بعضی پاکستان میں بھی اکثر لڑکیاں پردہ نہیں کرتی ہیں اور نہ نکاح خواں انہیں شکلاً پہچانتے ہیں پھر بھی وہ اندر کمرے میں رہتی ہیں وہیں وہ رجسٹر پر دستخط اور تین بار "ہاں" گواہوں کی موجودگی میں کرتی ہے مگر یہ بات نکاح خواں صاحب کی سمجھ میں نہ آئی اور دلہن کو باہر آنا پڑا تب جا کر نکاح ہوا۔ ان لوگوں کے رہن سہن اور کھانے پینے میں اب بھی ہندوستانی طرزِ معاشرت کی خاصی جھلک موجود تھی مثلاً کھانے میں پوری گوشت سبزی (گوشت ہر جانور کا) شراب سبھی چیزیں ایک ٹیبل پر موجود تھیں۔ نکاح دن کو ہوا تھا اور دن ہی کا کھانا تھا۔ نکاح خواں صاحب نے تو کھانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ حرام حلال کی تمیز نہیں ہے۔ گھر میں زیادہ تر خواتین اسکرٹ بلاؤز میں تھیں۔ کچھ نے ساڑی بھی باندھ رکھی تھی لیکن بالکل اسی طرح جیسے ہمارے یہاں بھنگیں باندھتی ہیں۔ خیر ساڑھی تو کیسے بھی باندھی ہو لیکن ہم قصداً انہی خواتین کے پاس جا کر بیٹھے تھے کہ پتہ چلے کہ ساڑھی سے لگاؤ کی وجہ کیا ہے اب جب کہ صدیوں سے ساڑھی کے دیس سے ان کا ناطہ ٹوٹا ہوا ہے۔ گھریلو زبان ان کی ڈچ تھی لیکن جو ڈچ نہیں سمجھ سکتے

تھے ان سے بڑی عمر کی خواتین اور مرد ٹوٹی پھوٹی ہندی بول لیتے ہیں۔ شادی کی رسومات تو بالکل نہ ہوئیں مگر ریکارڈ پر ہندوستانی گانے، نعت، اور بھجن مستقل ہو رہے تھے جب نعت ہوتی تھی تو مسلمان عورتیں سروں کو اسکارف یا آنچل سے ڈھک لیتی تھیں چنانچہ چوری چھپے ہندوستانیت یہاں بھی دخل دیئے بیٹھی ہے۔ ہم سوچتے رہے۔

لڑکی کے ایک چچا (جانے سچ مچ کے یا منہ بولے) بھی شادی میں نہ صرف موجود تھے بلکہ لپک جھپک کر میزبانی کے فرائض بھی ادا کر رہے تھے۔ ان کی بیوی بہت ہی موٹی سی اسکرٹ بلاوز میں تھیں۔ ان صاحب سے باتیں کر کے مجھے ہندوستانی نژاد سرنامیوں کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوئیں جن کو کتابوں میں پڑھ کر جاننے کا موقعہ مجھے شاید کبھی نہ ملتا۔ انہوں نے تو اپنے باپ دادا کی آپ بیتی بتائی جس میں رنگ آمیزی کا بالکل دخل نہ تھا۔ نہ دروغ مصلحت آمیز کی ضرورت تھی جن دنوں ڈچ لوگوں نے ہندوستان پر اپنا تسلط جمایا تھا۔ انہیں سستی انسانی محنت کی ضرورت تھی۔ اپنا ستارہ عروج چمکانے کے لیے۔ بہت سے ہندوستانی نوجوانوں کو جو روزگار کی تلاش میں تھے۔ اسکول اور کالج کے بچوں کو یہ لوگ سبز باغ دکھا کر سُرنام لے گئے تھے۔ بہتیرے تو اغوا کر کے جہاز میں لاد کر پہنچائے گئے ان میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل تھے واحد اور بہت پائیدار قدر مشترک ان اغوا کیے جانے والوں یا تحریص کے زیر اثر جانے والوں میں صرف یہی تھی کہ یہ سب ایک ہی دیش کے باسی اور ایک ہی آقا کے غلام تھے۔ یہ صاحب جو یہ واقعات بیان کر رہے تھے ان کا نام بدری پرشاد تھا اور یہ واقعہ ان کے پرکھوں وغیرہ کے دقتوں کا تھا۔ ایک بار جب وہ سرنام پہنچ گئے تو جو جہاز انہیں لے کر آیا تھا وہ واپس چلا گیا۔ اپنے گھر والوں سے خط و کتابت کے ذریعہ بھی کوئی رابطہ قائم نہیں ہو سکا کیوں کہ جبری طور پر جن سے محنت کرائی جاتی ہے انہیں قید کر کے رکھنا لازمی ہوتا ہے جیسے آج پاکستان میں

خم کار کرتے ہیں۔

ہندو اور مسلمان جو نوجوان بھی وہاں گئے تھے سب کا دکھ مشترک تھا چنانچہ ان میں ہوتے ہوتے بھائی چارگی اور خلوص بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان آپس میں شادی بیاہ کا سلسلہ بھی چل نکلا لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ شہنشاہ اکبر کی مانند جس نے ہندو عورت سے شادی کے بعد بھی نہ اپنا مذہب تبدیل کیا نہ اس کی بیوی نے اپنا مذہب بدلا، بدری پرشاد نے مجھے بتایا کہ خود ان کے والد مسلمان تھے اور ان کے دو بھائی بھی مسلمان ہیں لیکن ان کی والدہ ہندو ہی رہیں جب ان کے والد قریب المرگ ہوئے تو انہوں نے اپنے بیٹوں کو بلا کر کہا کہ دیکھو اب میں تو چلا لیکن تمھاری ماں ہندو ہے اور جب وہ مرے تو اس کا کریا کرم اسی کے دھرم کے مطابق کرنا۔ ایک اور سرونامی مسلم گھرانے سے ملاقات ہوئی۔ نماز اور قرآن شریف سبھی کا سلسلہ ان کے یہاں تھا۔ ہم نے قرآن شریف اٹھا کر دیکھا یہ احمدی فرقہ کی شائع کردہ تھی۔ ہم نے پوچھا کیا آپ لوگ احمدی ہیں؟ جواب سن کر ہم دنگ رہ گئے کیوں کہ جواب ملا کہ احمدی کیا ہوتا ہے۔ بس ہم مسلمان ہیں جیسے آپ مسلمان ہیں۔ صاحب خانہ خاتون نے بتایا کہ ہمارا ابا بہت بڑا مولوی تھا اور مدرسہ میں درس دیتا تھا۔ یہ عورتیں ڈچ اور ہندی دونوں زبانیں بولتی تھیں مگر چونکہ ہندی کی اصل سرزمین سے سینکڑوں برس سے ناطہ ٹوٹا ہوا تھا اس لیے عجیب سی ہندی تھی جو مشکل ہی سے سمجھ میں آسکتی تھی مثلاً بیٹا تمھاری متاری کی کرے ہے (بیٹا تمھاری ماں کیا کر رہی ہے) ہمیں صحیح معنوں میں یہ لوگ بین الاقوامی نسل کے نمائندے معلوم ہوئے جنہوں نے ذات پات اور عقیدہ سے بالاتر ہو کر ایک نئے عالمی کلچر اور تہذیب کی بنیاد ڈالی ہے اگر ماضی کے ورثہ سے ان کا رابطہ رہتا تو شاید یہ بہت کچھ انسانیت کو دے سکتے۔ یہ لڑکی جس کی شادی تنویر کے دوست سے ہوئی تھی اکثر ہمارے یہاں

آتی رہتی تھی اور چونکہ اس کا شوہر پاکستانی تھا اس لیے اپنے آپ کو پاکستانی رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ ہندوستانی عورت کا خون تھا۔ حالانکہ وہ لڑکی بھی مغربی لڑکیوں کی مانند تیراکی کا لباس پہننے والوں میں تھی۔ پتہ نہیں پاکستانی لڑکے ساتھ اب اُس کی کیسی نبھ رہی ہے۔

ہالینڈ ہی سے ٹرین کے ذریعہ یورپ کے مختلف ممالک کی سیاحت کی مگر چونکہ ملکوں کے جغرافیائی خدوخال سے زیادہ مجھے وہاں حاصل کئے ہوئے تجربات دلچسپ اور دلکش لگتے ہیں اس لیے ہم مغربی ممالک کی حسن صفائی، نفاست اور تفریحی مقامات کی تفصیل میں نہیں جائیں گے یوں بھی یہ تو ایسی چیزیں ہیں جو ہر جانے والا بخوبی لطف اندوز ہو سکتا ہے اس لیے ہم اپنے آپ کو محدود کریں گے صرف تجربات اور تجزیات پر۔

اسکول میں جب تاریخ برطانیہ پڑھی تھی تو انگلستان کا ایک خاص رومانٹک تصور ذہن پر نقش تھا۔ کشتی اور ناؤ پر تو گنگا کی لہروں میں بہت ہی ڈولے تھے۔ مگر باہر کے ملکوں کے دریاؤں اور اسٹیمر کے سفر کا شوق تھا۔ بین الاقوامی سمندری سفر کا تو خیر اب تک اتفاق نہیں ہوا ہے۔ بہر حال لندن جانے کے لیے ہم نے ہوائی جہاز کی بجائے اسٹیمر ہی کا انتخاب کیا تاکہ انگلش چینل بھی دیکھ سکیں اور مغربی ناؤ بھی۔ جب پٹنہ سے مظفر پور جاتے تھے تو مہندرو گھاٹ پر اسٹیمر پر سوار ہوتے تھے۔ یہ دو ڈھائی گھنٹے میں دیگھا گھاٹ پہنچاتا تھا جہاں سے ٹرین ملتی تھی جو پھر تین چار گھنٹے میں مظفر آباد پہنچاتی تھی (اب تو گنگا پر بھی پل بن گیا ہے اور ایک گھنٹہ میں پٹنہ سے مظفر پور کار سے پہنچ جاتے)، مگر کیا مزہ آتا تھا اس خاک دھول سے اٹے ہوئے سفر میں۔ سو مغربی اسٹیمر سے انگلش چینل پار کرتے مجھے بار بار دریائے گنگا کی

یاد آئی۔ وہی گنگا جسے پار کر کے جس کی لہروں کے ہچکولوں پر اپنے دل کے ہچکولوں کو سمیٹے آنسوؤں سے تر آنکھیں لیے میں پہلی بار سسرال گئی تھی اور پھر ظاہر ہے جب میں نے انگلش چینل کے سینے پر سفر کیا اس وقت تک میرے لیے سارے افق اداس ہو چکے تھے۔ بس ایک تجربہ کرنا تھا کہ زندگی تو نام ہے تجربہ کا۔ میرا سفر رات کا تھا اس لیے دریائی مناظر سے لطف اندوز نہ ہو سکے۔ یہ بھی اندازہ نہ ہو سکا کہ ہمارے پرانے آقاؤں کی چینل کا پانی اتنا ہی سفید اتنا ہی پوتر ہے جتنا کہ گنگا کا۔ ویسے ہم اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش ضرور کرتے رہے کہ شاید انگریزوں کے دیس کے سفید پانی سے روشنی کی کرنیں بھی اُبلتی ہوں مگر لاحاصل۔ جہاز جس گھاٹ پر رُکا اس کا نام یاد نہیں آ رہا ہے۔ مگر وہیں سے ٹرین پکڑ کر مجھے لندن پہنچنا تھا۔ تنویر اور عفت ہوائی جہاز سے صبح سویرے ایمسٹرڈم سے روانہ ہو کر لندن اسٹیشن پر مجھ سے ملنے والے تھے۔ میرے پاس ایک سوٹ کیس تھا اور ہم نے سُن رکھا تھا کہ باہر کے ملکوں میں قلی نہیں ہوتے اور اپنا سامان خود اٹھانا پڑتا ہے لیکن اسٹیمر کے رکتے ہی دیکھا کہ قلی اسی طرح اچک اچک کر اندر داخل ہوئے جیسے ہمارے یہاں ہوتا ہے شروع میں تو سمجھ ہی میں نہ آیا کہ یہ سچ مچ میں قلی ہی ہیں یا یونیفارم میں ملبوس نیوی وغیرہ کے افسر۔ تھوڑی دیر تک تو اپنی قوتِ شناخت کو بروئے کار لانے کی کوشش کرتے رہے پھر جب یہ اعتماد نہ ہوا کہ ہم صحیح طبقہ کی نشاندہی کر سکیں گے تو انکوائری سے پوچھ کر اطمینان کر لیا کہ واقعی میں یہ گورے گورے لوگ نیلے کپڑے پہنے ہوئے قلی ہی ہیں اور ہم جیسے رنگدار قوم کے افراد بھی ان سے اپنا بوجھ ڈھوا سکتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر بھی بڑی خوشی ہوئی کہ دیکھو آخر انگریز قوم سے ہم نے انتقام لے ہی لیا۔ انہوں نے ہندوستان میں ہم پر حکمرانی کی تو ہم نے بھی لندن آ کر انہی کے دیس میں انہیں اپنا قلی بنا لیا دل میں تو یہ سب سوچ سکے مگر قلی کو پکار کر اسے اپنا سامان اٹھانے کے لیے کہنے میں بہت

ڈر لگ رہا تھا کہیں وہ یہ نہ کہہ دے کہ ہم صرف گورے لوگوں کا سامان اٹھاتے ہیں مگر صاحب میرے سارے خدشات بے بنیاد نکلے۔ ہم نے اپنی دانست میں بہت صحیح انگریزی بہت اچھے تلفظ اور بہت شائستہ انداز میں قلی کو سامان اٹھا کر ٹرین کی طرف لے چلنے کو کہا تو اس نے مجھ سے بھی زیادہ شائستہ انداز میں میرے حکم یا درخواست کی تعمیل کی۔ انگریزی تو گرامر کے لحاظ سے وہ صحیح بول سکتا تھا یا نہیں اللہ ہی جانے مگر لہجہ اور ریجنل ہونے کی وجہ سے مجھے بار بار EXCUSE ME کہنا پڑتا تھا۔ اب میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ میں اس قلی کو مزدوری کتنی دوں میرے پاس دس دس پونڈ کے نوٹ تھے۔ قلی سے میں نے پوچھا کہ تمھیں کیا دوں تو بڑی متانت سے اس نے کہا کہ جو آپ مناسب سمجھیں۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس دس پاؤنڈ کے نوٹ ہیں اور ہم دنگ رہ گئے جب وہ مجھے ایک کاؤنٹر پر لے گیا اور میرے دس پاؤنڈ کے چھوٹے چھوٹے نوٹ تبدیل کرائے اور جب میں نے اسے ایک پاؤنڈ دیا تو شکریہ ادا کر کے لیا اور چلا گیا تو یہ ہے فرق اس قوم کے افراد میں۔ جنہوں نے ہندوستان پر حکومت کی اور ان افراد میں جو ان سے قلی کا کام لیتے ہیں۔ یہاں مجھے زبردست احساس کمتری ہوا۔ ہمارے ملک میں اگر کوئی غیر ملکی آتا ہے تو اسٹیشن یا ائرپورٹ پر قلیوں کا وطیرہ یہ ہوتا ہے کہ مسافر کو زیادہ سے زیادہ لوٹا جائے ارے غیر ملکی کی بات تو جانے دیں، ملکی بھی اگر بیرون سفر سے واپس آتا ہے تو اس کا بھی یہی حشر ہوتا ہے۔ آخر لندن کے قلی اعلیٰ تعلیم یافتہ تو نہیں ہوتے ہاں یقیناً باشعور زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ بات مجھے طوعاً کرہاً ماننی ہی پڑی۔

تھوڑی دیر پہلے انتقام لینے کی جتنی خوشی مجھے ہوئی تھی سب پر اس قلی نے اپنی انکساری اور باوقار رویّہ کی بدولت پانی پھیر دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے اندرونی کمینہ خیالات کو سمجھ کر اس نے مجھے جتلا دیا کہ ہم صحت مند ذہنیت کے ساتھ

انتقام لینے کے اہل بھی نہیں ہیں۔

ٹرین کے آنے میں دیر تھی۔ صبح کے چھ بج رہے تھے اور سردی بے تحاشا تھی ہم ایک ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑے تھے جہاں سے لوگ کافی لا کر پی رہے تھے۔ ان دنوں مجھے باہر والوں کے ساتھ انگریزی بولنے میں جھجک ہوتی تھی کہ کہیں یہ لوگ میرے غلط تلفظ کی ہنسی نہ اڑائیں۔ گویا باہر جا کر ہم اس قدر احساس کمتری کا شکار ہو گئے تھے کہ یہ بات بالکل بھول بیٹھے تھے کہ ہمیں اپنی مادری زبان پر فخر ہے۔ وہی قابلِ فخر مادری زبان جس کے چکر میں ہم نے بخوشی اپنا آدھا وطن عزیز گنوا دیا اور یہ کہ ہم جتنا بھی انگریزی بول لیتے ہیں انگریزی زبان پر احسان ہی کرتے ہیں۔ بھلا یہ احساس کمتری نہیں تو اور کیا ہے کہ اگر کوئی انگریز" ہم آیا تم گیا" بول دے تو ہم مارے خوشی کے وارفتہ ہو جاتے ہیں کہ دیکھو ٹانگ توڑ کر ہی سہی مگر ہماری زبان تو بولا اور جب اپنی باری آتی ہے تو شرم سے پانی پانی ہو جاتے ہیں کہ اہلِ زبان کا سا تلفظ نہیں ادا کر پاتے۔ اصل میں شاید یہ جذبہ، آزادی کے اتنے دنوں بعد بھی دل سے نہیں گیا ہے کہ انگریز ہر چیز میں ہم سے برتر ہے اور جائے بھی کیسے۔ پہلے تو ہم سمجھتے تھے کہ ہماری ساری مصیبتوں کی جڑ انگریز ہیں۔ یہ گئے نہیں کہ دودھ اور شہد کی نہریں ہمارے ملک میں بہنے لگیں گی اور ہم سیراب ہوتے رہیں گے۔ لیکن اس دوران جس ذہنیت اور عملی کارکردگی کا ہم نے مظاہرہ کیا من الحیث القوم اور من الحیث الفرد وہ تو کچھ امید افزا اب تک نہیں رہا ہے۔ اپنے سیاسی نظام کو درست نہ کر سکے تو معیشت اور کردار کیا خاک درست ہوگا۔ انسان اور قوموں کے کردار کا زبردست دار و مدار معیشت اور نظامِ حکومت پر ہوتا ہے۔

بہر حال بات ہو رہی تھی سردی اور کافی کی۔ جھجکتے جھجکتے ہم اندر کیفے ٹیریا میں داخل ہوئے۔ اندر کاؤنٹر پر کوئی نہ تھا۔ دیکھا کہ لوگ ایک ٹب کی جیسی چیز کھول

کر اور گتے کے گلاس ہیں، جو وہیں پر ڈھیر رکھے ہوئے تھے، کافی بھر رہے ہیں۔ ہاں خدا کا شکر ہے کہ اس کے پہلے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اسی جگہ کافی کی قیمت کا سکہ ڈالنے کا ایک مشین میں نحول بنا ہوا ہے۔ مجھے شکر اور دودھ کہیں نظر نہ آیا۔ اس لیے کالی ہی کافی غٹا غٹ پی لی تو سردی سے ذرا جان میں جان آئی۔ اب جب اطمینان سے نظر دوڑائی تو شکر کی ٹکیہ اور دودھ کی پڑیا وہیں پر نظر آئی۔ سو دوسری بار کی کافی ذرا ڈھنگ کی نصیب ہوئی۔ دوسرا کپ چڑھا کر جب دماغ ذرا کام کرنے کے قابل ہوا تو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اتنا بھاری سوٹ کیس لے کر ہم ٹرین تک جائیں گے کیسے۔ وہاں پر کوئی قلی بھی نظر نہیں آ رہا تھا اور ہمیں یہ بھی پتہ نہ تھا کہ یہاں وہ ملے گا بھی یا نہیں۔ پھر ہم نے دیکھا کہ کچھ نوجوان جوڑے ٹہل رہے تھے۔ ہم نے ایک لڑکے سے کہا کہ ٹرین آنے پر کیا تم میرا سامان ٹرین میں پہنچا دو گے؟ اور میری خوشی اور تعجب کی انتہا نہ رہی جب اس لڑکے نے بڑی مستعدی سے کہا "اوہ یقیناً" پھر اس نے مجھے مزید اطمینان دلانے کے لیے کہا کہ "آپ پریشان نہ ہوں جب ٹرین آئے گی تو میں پہلے آپ کا سامان رکھوں گا پھر اپنا لے جاؤں گا" اب سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہم اس لڑکے کی لفاظی پر بھروسہ کر کے اس کا پیشگی شکریہ ادا کریں کہ نہ کریں کیونکہ اپنے ملک میں تو اکثر ایسے وعدے تلخ تجربہ ہی ثابت ہوا کرتے تھے۔ تھوڑی دیر میں ٹرین آ گئی اور اس لڑکے نے بڑے آرام سے مجھے ٹرین میں مع سامان سوار کرا دیا۔ ادھر فوراً میرے ذہن نے اپنے ملک کے نوجوانوں سے اس لڑکے کا موازنہ شروع کر دیا اور نتیجہ ظاہر ہے اس موازنہ کا کیا نکلا ہو گا۔

لندن کا اسٹیشن دیکھ کر مایوسی ہوئی یہ تو ہم نہیں کہیں گے کیوں کہ پہلے ہی لندن کی گندگی اور اس کی سیاہ عمارتوں کا شہرہ سن چکے تھے۔ یہاں قلی مختلف رنگ و نسل کے اور وافر تعداد میں نظر آئے۔ سامان ہم نے پروگرام کے مطابق کلاک روم میں رکھوا دیا اور خود بک اسٹال پر آکر کتابوں کا معائنہ کرنے لگے کہ تنویر سے اسی بک اسٹال پر ملنے کا پروگرام طے ہوا تھا۔ اسٹیشن تو اتنا بڑا کہ اس کی وسعت میں کھو جانے کا ڈر ہر دم لگا ہوا تھا۔ مگر اس خاص بک اسٹال کو ہم نے اپنا لینڈ مارک بنا کر اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کر دیا کیوں ہمیں یہاں آئے کافی دیر ہو چکی تھی اور تنویر کا کوئی پتہ نہ تھا جب کہ پروگرام کے مطابق انہیں میرے پہنچنے سے پہلے وہاں موجود رہنا تھا۔ مجھے وہاں دو تین گھنٹے انتظار کرتے کرتے ہو گئے تھے۔ یہاں پھر مجھے ندامت کا سامنا یوں کرنا پڑا کہ کئی انگریز جو شاید دیر سے مجھے وہاں ٹہلتا دیکھ رہے تھے یکے بعد دیگرے میرے پاس یہ پوچھنے آئے کہ "اگر آپ کو کوئی مشکل درپیش ہو تو بتائیں میں مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے انہیں بتایا کہ میں اپنے بیٹا کا انتظار کر رہی ہوں اور ان کے پوچھنے کا شکریہ ادا کیا۔ ندامت یوں ہوئی کہ قدم قدم پر یہ انگریز قوم مجھے اپنے اخلاق اور حسنِ سلوک سے متاثر کیے دے رہی تھی۔ یہ اسی انگریز قوم کے افراد تھے

جن سے آنکھ کھولتے ہی میں نے نفرت کرنا سیکھا تھا۔

خیر خدا خدا کر کے دور سے تنویر اور عفت آتے نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ موسم خراب ہونے کی وجہ سے ان کے ہوائی جہاز نے دیر سے پرواز کی۔ بہرحال اب میری ذمہ داری تنویر کی طرف منتقل ہو چکی تھی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ بجائے منزل پر جانے کے ہم لوگ کچھ کھا پی کر یہیں سے شہر گھومنے نکل چلیں۔ کیوں کہ اب دیر کافی ہو چکی تھی اور اگر گھر جاتے تو گھومنے کا موقع آج ہاتھ سے نکل جاتا۔ شام کو ایک بار ہی کلاک روم سے سامان لے کر گھر جانے کا پروگرام بنایا۔ جن صاحب کے یہاں ٹھہرنے کا پروگرام تھا ان کو فون سے اپنے پروگرام کی اطلاع کر دی۔ انڈر گراؤنڈ اسٹیشن پہنچے تو شہر کے شوق دید کی جلدی میں ایک پیر کی سینڈل لاٹن سے نیچے گر پڑی۔ چونکہ دوسری سینڈل سامان کے ساتھ کلاک روم میں تھی۔ اس لیے ہم ٹرین میں ایک پیر کی سینڈل سمیت سوار ہو گئے۔ مصیبت یہ کہ اتوار کا دن تھا اور شہر کی ساری دکانیں بند۔ گھومنے کا شوق غالب۔ ناچار ہم نے دوسرے پیر کی چپل بھی اتار پھینکی اور ننگے پیر ہی سرزمین مغرب کی سیاحی شروع کر دی۔ لندن کو بظاہر بحیثیت شہر کے دیکھ کے گھٹن کا احساس ہوتا ہے لیکن اس میں گہرائی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگ ساری ترقی کے باوجود اب بھی ایک آبائی تہذیب اور میراث کے مالک ہیں۔ برٹش میوزیم، برٹش لائبریری، میڈیم کیوری کا موم گھر کے علاوہ اور بہت ساری خاصی مشہور چیزیں دیکھنے اور درس عبرت لینے کی ہیں۔ صحیح معنوں میں انہیں دیکھنے کے لیے خاصا طویل عرصہ چاہیئے۔ پھر بھی ہم لوگ ہفتہ دس روز میں خوب خوب گھومے۔ میڈم کیوری کے موم گھر میں تو مومی مجسمے کو ہاتھ لگائے بغیر یقین نہیں آتا کہ یہ اصلی لوگ نہیں ہیں اور ہاتھ لگانا منع۔ نقل کو اصل نہ سمجھنے میں ایک ہی حقیقت مانع تھی کہ بڑی اور عظیم شخصیتوں کے وہاں پر اصل میں کھڑے رہنے کا کوئی جواز ہی نہ تھا۔ لیکن ہزار کوششوں

اور تنویر کے ناں ناں کرنے کے باوجود ایک غیر معروف سے مجسمہ کی ناک پر انگلی رکھ ہی دی۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ گھبرا کر پیچھے ہٹے اور مجسمہ سے معافی مانگتے برا حال تھا۔ ایک روز ایک ہندوستانی ہوٹل میں کھانے گئے کیوں کہ اپنی طرف کا کھانا کھائے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔ بالکل بسم اللہ ہوٹل یا ایرانی ہوٹل کا سا ماحول اور ذائقہ تھا جانے ہم لوگوں نے حرص میں آکر زیادہ کھا لیا یا کھانے ہی میں کچھ گڑبڑ تھی کہ رات بھر ہم اور عفت پیچش اور پیٹ کے درد سے تڑپتے رہے۔ صبح کو جا کر دوا ملی تو کچھ افاقہ ہوا۔ پھر اس ہوٹل کے نزدیک بھی ہم لوگ نہ پھٹکے۔

یورپ کا پہلا سفر چار ماہ پر مشتمل تھا۔ خوب گھومے خوب دیکھا سمجھا اور پرکھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے۔ ہم اپنی سیاحت میں ان مقامات کا تقریباً بالکل ذکر نہیں کریں گے جن کا تعلق صرف سرزمین اور اس کے حسن یا ادب وفن سے ہے۔ اصل میں میری یہ سیاحت ایک طرح سے تہذیبی سیاحت تھی۔ زندگی کی طرف ہمارا کیا رویّہ ہے اور ان کا کیا رویّہ ہے۔ جیسا کہ میں نے اکثر جگہ تذکرہ کیا ہے۔ میں نے وہاں کی قوم میں اور وہاں کے افراد میں خامیوں کے ساتھ بہت ساری خوبیاں پائیں ایسی جن کے اہل تو ہم بھی ہیں لیکن جنہیں نامساعد ماحول کی وجہ سے ہم نے اپنی زندگیوں سے نکال پھینکا ہے۔ میں نے اہلِ مغرب میں وہ خوبیاں پائیں جنہیں انسانیت کا طرہ امتیاز کہا جا سکتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی میرا یہ خیال راسخ تر ہو گیا کہ مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق ہے۔ یہ دونوں تہذیبی اعتبار سے (اللہ نہ کرے) کبھی نہیں مل سکتے یا کم از کم میرا دل چاہتا ہے کہ نہ ملیں خواہ دنیا سمٹ کر کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو جائے۔ لندن عام طور سے مغربی دنیا کے دوسرے ممالک کے مقابلہ میں رجعت پرست شہر سمجھا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے اور ان کے سماجی اور مادی، اخلاقی اقدار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہم کراچی سے گئے تھے جو پاکستان کا انتہائی مغرب زدہ شہر ہے۔ پھر بھی یہاں کی "نجات یافتہ عورت" اس لبریشن کا تصور بھی نہیں کر سکتی جو وہاں کی عورتوں کو میسّر ہے۔ کراچی میں لڑکی کی شادی خواہ کسی بھی عمر میں ہو دولہن بننا گھونگھٹ نکالنا اس کی زندگی کا سب سے حسین اور سہانا خواب ہوتا ہے۔ لیکن توبہ کیجئے صاحب وہاں آپ سمجھا سمجھا کر اپنی ناکامی پر خودکشی کرنے پر آمادہ ہو جائیں تب بھی کسی لڑکی کی سمجھ میں یہ بات

نہیں آسکتی ہے کہ گھونگھٹ ہوتی کیا بلا ہے BRIDE AND BRIDE GROOM کا اردو ترجمہ دولہا دلہن تصوراتی لحاظ سے وہ مفہوم ادا ہی نہیں کرسکتا جن خوابوں کا تعلق دولہا دولہن بننے میں ہے وہ BRIDE AND BRIDE GROOM میں کہاں۔ چوڑی ہمارے یہاں سہاگ کی نشانی ہے۔ چوڑیاں وہاں بھی پہنی جاتی ہیں مگر ان سے کوئی حسین جذبہ کوئی رومانٹک تصور وابستہ نہیں ہوتا۔ نہ یہ چوڑیاں کسی پیارے کے مرنے پر سہاگ کے اجڑنے پر توڑی جاتی ہیں عید بقر عید شادی بیاہ کے موقعہ پہ ہاتھوں پیروں پر مہندی کی رنگ آمیزی جذبہ دل کی ایک الگ داستان ہے۔ ہمارے یہاں کی عورت سماج کی بہت ساری ظالمانہ اور ناجائز رتیوں سے بغاوت کی ہمت اب تک اپنے آپ میں پیدا نہیں کرسکی ہے۔ خواہ وہ پردہ کی بندشوں سے آزاد اور تعلیم یافتہ ہی کیوں نہ ہو جائے لیکن مغرب میں اب خاص طور پر دوسری جنگِ عظیم کے بعد سماج کی کوئی ایسی ظالمانہ ریت ہے ہی نہیں جس سے بغاوت کی ضرورت پیش آئے۔ ہمارے یہاں مردوں کے لیے دوسرا اخلاقی معیار ہے عورتوں کے لیے دوسرا۔ وہاں ہمارے نظریہ کے مطابق اخلاقی معیار کا سرے سے چلن ہی نہیں ہے۔ ہمارے یہاں کی محبت دل کے جذبات کے اعلیٰ محسوسات کا نام ہے اور وہ دل میں جنم لیتی ہے وہاں جسمانی قربت ہی کو محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں دولہن لجاتی شرماتی سسرال والوں کے ساتھ پھولوں سے سجی موٹر میں ساجن کے دیس جاتی ہے، ساتھ ہی نصیحتوں دعاؤں اور ڈولی پر بدائی کے گیتوں کے انبار لے جاتی ہے۔ وہاں لڑکی چرچ سے (اگر بالفرض محال شادی کرنی ہی پڑی تو) اپنے ہسبنڈ کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے نکلتی ہے۔ ہمارے یہاں مشرقی حیا ضرب المثل ہے۔ مغرب کی بیٹی کے کان اس حیا کے نام سے اور مفہوم سے ناآشنا ہیں۔ ہمارے یہاں بیٹی سارے

خاندان ہی کی نہیں سارے معاشرے کی لاج ہوتی ہے۔ مغرب کی بیٹی لاج کا مطلب ہی نہیں سمجھتی۔ ہمارے یہاں کی بیٹیوں کے ماتھے پر آنچل ہوتا ہے اور بہت ہی خوب ہوتا ہے لیکن جب ملک وقوم عقیدے اقدار اور اصولوں کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اس آنچل کو اپنے آئیڈیل کا پرچم بنا لینے سے بھی گریز نہیں کرتیں مغرب کی بیٹی آنچل کا تقدس تو نہیں جانتی ہے لیکن وہ اپنی جنسی خودسری کے بہتے ہوئے دھارے کو ویمن لبریشن کا نام ضرور دے بیٹھتی ہے۔

سماج کے بہت سارے رسم و رواج نہ صرف ہمارے یہاں بلکہ بہت سارے ترقی پذیر اور پسماندہ معاشرے میں اکثر اوقات ظالمانہ اور فرسودہ ہوتے ہیں۔ عورتوں پر بے تحاشا مظالم توڑے جاتے ہیں۔ جانوروں کے خلاف مظالم کی روک تھام تو ہوتی ہے مگر عورتوں پر مظالم کے خلاف ایسے ملکوں میں بہت کم احساس بیدار ہوا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ انسان سماج سے باہر بغیر کسی پابندی کو عائد کیے ہوئے نہیں رہ سکتا۔ اس لیے سماج کے غلط اور ظالمانہ اصولوں کی ایسے اصولوں کی جو ایک جنس کی برتری دوسری جنس پر قائم رکھنے میں معاون ہیں نہ صرف مخالفت ہونی چاہیئے بلکہ انہیں ختم کر دینے کی سعی عورت اور مرد دونوں کا فرض ہے۔ مگر بذات خود سماج یا معاشرہ سے نفرت کر کے ہر اصول پر بندش کو توڑ کر انسان کو جنگلوں کی سی زندگی گزارنے کی ترغیب نہیں دی جا سکتی۔

فرد اور سماج کے درمیان کشمکش شاید ازل سے چلی آ رہی ہے۔ شاید اس وقت سے جب کچھ لوگوں نے سماج کے بل بوتہ پر اپنے سے کمزوروں کو اپنا غلام بنانا شروع کیا۔ فرد کو اچھی زندگی گذارنے کے لیے بہت ساری پابندیوں کے ساتھ معاشرہ کی عاید کردہ اخلاقی پابندیوں کی بھی ضرورت ہے۔ ہمارا کام ایسے نئے معاشرہ کی تعمیر و تشکیل ہے جہاں عورت مرد دونوں پر یکساں بندش ہو۔

اکتوبر ۷۶ء کے اوائل میں، میں نے کالج سے ایک سال کی فرصت لی اور عازم کناڈا ہوئے کہ اس وقت تک چاروں بیٹے کناڈا جا چکے تھے۔ راستے میں دو ہفتہ کے لیے لندن رکے۔ تنویر مانٹریال میں تھے اور جاوید نابید ندیم تینوں ہی ٹورنٹو میں یہ تینوں بھی مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے مانٹریال آ گئے تھے۔ بہت دنوں کے بعد چاروں بیٹوں کا سنگت مجھے میسّر آیا تھا۔ سو شروع شروع میں تو طمانیت کے اس بھرپور احساس نے مجھے جھنجھوڑا نہیں بلکہ خوابیدہ سا کر دیا۔ بہت محنت جسمانی اذیت جھیلنے کے بعد جیسے کسی کو پیتھیڈرین کا انجکشن لگا دیا جائے کچھ وہی کیفیت اپنی تھی۔

وہاں پہنچتے ہی ہم نے پی ایچ ڈی کے لیے MCGILL یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ اس یونیورسٹی کا نام بدل کر اب کچھ اور رکھ دیا گیا ہے۔ صبح سویرے اُٹھ کر بس سے چلے جاتے تھے اور شام کو گھر واپس آتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم کی فیس وہاں کافی ہوتی ہے اور یہ فیس تنویر ادا کرتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد ضمیر نے ملامت کرنا شروع کیا کہ شوہر کی کمائی سے پڑھ لیا سو پڑھ لیا کہ یہ تعلیم بعد میں ان کے انتقال کے بعد انہی کے بچوں کے کام آئی۔ مگر ان بچوں کی کمائی سے ڈگریاں حاصل کرنا کچھ مناسب نہیں معلوم ہوا۔ جہاں تک سروس میں پاکستان واپس جانے کے بعد فائدہ ہونے کا سوال تھا تو ہم ڈگری لے کر آتے بھی تو صرف دو اضافہ تنخواہ میں ملتا اور یہاں ڈگری کے پیچھے ہزاروں روپیہ کا خرچ تھا۔ جہاں تک حصولِ علم کا سوال ہے تو یہ مسلسل عمل ہے۔ ڈگری لینے نہ لینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لیے میں نے یونیورسٹی والا چکر ہی ختم کر دیا۔ اُن دنوں مانٹریال (صوبہ کیوبک) میں حکومت کی طرف سے

امیگریشن پر آنے والوں کو اسکول میں فرینچ پڑھائی جاتی تھی اور اس کے لیے چار سو ڈالر ماہانہ الاؤنس ملتا تھا۔ میں۔ نے وہاں درخواست دی اور داخلہ مل گیا۔ ان دنوں کیوبک میں خود مختاری کی تحریک کا بڑا زور تھا جسے دیکھ کر بنگلہ دیش کی علیحدگی کی یاد از سرِ نو تازہ ہو اُٹھی۔

فرینچ کلاس میں آٹھ نو مہینے تک جاتے رہے۔ اچھی خاصی فرینچ سیکھ لی تھی اگر مشق جاری رکھتے تو شاید فرینچ دانوں میں آج شمار ہوتا۔ جو وقت یونیورسٹی اور فرینچ اسکول میں گذرا اس میں مجھے مقامی لوگوں (کینیڈین) سے ملنے جلنے اور ان کے معاشرتی طرزِ زندگی کو دیکھنے کا خوب موقعہ ملا۔ عورتوں کی آزادی سے زیادہ ان کی عریانیت کو دیکھ کر ہم بوکھلا گئے بلکہ سچ پوچھیئے تو نام نہاد آزادی کے نام پر عورتوں کو بے وقوف بنا کر خوب ہی خوب ان کا جنسی استحصال ہو رہا ہے۔ سردیوں کے موسم تک تو خیر غنیمت تھا لیکن موسم بہار اور گرما کیا آیا کہ عورتیں لباس کی بندش سے کم و بیش آزاد ہی ہو گئیں۔ دنیا گول ہے اور ہر چیز گھوم پھر کر وہیں آجاتی ہے جہاں سے چلی تھی۔ انسان ابتدائی دور میں لباس کی قید سے آزاد تھا۔ اب مغربی تہذیب عروج کے اس نقطہ پر پہنچ چکی ہے جہاں سے نقطۂ آغاز شروع ہوتا ہے لیکن بڑی عجیب سی بات ہے کہ گرمیوں کے موسم میں بھی مردوں کے جسم پر عورتوں کے مقابلہ میں کپڑے زیادہ ہوتے ہیں۔

لیکن بے انصافی ہوگی اگر میں یہ تسلیم نہ کروں کہ انفرادی طور پر میرا واسطہ بہت سے ایسے لوگوں سے پڑا جن کے کردار کی بلندی کو سراہے بغیر نہیں رہا جا سکتا یہ واقعات بڑے چھوٹے چھوٹے اور بظاہر بڑے غیر اہم سے ہوتے تھے لیکن میرے ذہن پر انہوں نے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں اور اکثر ذہن میں خیال آتا ہے کہ اگر انفرادی اور اجتماعی طور پر ہم بھی انہیں خصوصیات سے مالا مال ہوتے تو شاید

رمضان مبارک کے مہینہ میں گھر سے باہر سڑکوں پر پانی پینے پر پابندی عاید کرنے کی ضرورت ہمارے یہاں نہ پڑتی۔ مانٹریال میں روزمرہ کے تجربات میں سے ایک کا بیان کرتے ہیں۔ ہم راستہ یاد رکھنے کے معاملہ میں بہت کچے ہیں۔ یونیورسٹی جانے کیلئے مجھے گھر سے بس لے کر میٹرو اسٹیشن جانا پڑتا تھا۔ پھر میٹرو یا ''سب وے'' سے تھوڑی دور آگے چل کر یونیورسٹی میں پہنچتے تھے۔ شروع میں اکثر ہوا کہ ہم سمت بھول کر غلط رُخ پر چل نکلے۔ مجھے یاد ہے کہ جب بھی میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی فرینچ یا انگلش میں کسی سفید فام سے راستہ پوچھا تو نہ صرف یہ کہ اس نے پوری لگن سے مجھے تفصیل سے راستہ بتایا بلکہ کھڑا ہو کر دیکھتا رہا کہ میں نے صحیح سمت اختیار کی یا نہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ بتانے کے بعد بھی جب ہم اگلے نشان، منزل پر پہنچے تو پھر غلط سمت اختیار کر لیا اور یقیناً راستہ بتانے والا شخص مجھے دیکھ رہا ہوگا کیوں کہ میرے بھٹکتے ہی وہ دوڑ کر میرے پاس آتا اور میری کمزوری کا اندازہ کر کے ساتھ چل کر یونیورسٹی تک چھوڑ آتا اور ایسا ایک بار نہیں متعدد بار ہوا۔ غیروں کے اخلاق اور خلوص کی اس فیاضی پر ہم شرمندہ ہو کر پانی پانی ہوتے رہتے اور اپنا اور ان کا موازنہ کر کے گھنٹوں کڑھتے رہتے ایک اور واقعہ جو میرے ساتھ ہوا اسے تو ہماری ملت کی آنکھوں کو چکا چوند کر دینا چاہیئے۔ ہم جو یہ فیصلہ کئے بیٹھے ہیں کہ مسلمان ہونے کے ناطے ہم دنیا کی ساری دوسری قوموں اور افراد سے کردار اور دیانت داری میں افضل ہیں۔ یہ واقعہ بھی چھوٹا سا ہے لیکن اپنی اہمیت کے لحاظ سے بڑا گہرا۔ ہوا یوں کہ فرینچ اسکول کے طلبا، پکنک کے لیے جا رہے تھے۔ جب یہ فیصلہ ہونے لگا کہ کھانے پینے کی اشیاء کیا کیا ساتھ جائیں گی تو میرے استاد نے جس کا نام پیرٹک تھا (اور عمر جس کی پچیس سال) چار پانچ بوتل کوک کی بھی لیجانے کا انتظام کیا کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ ہم شراب نہیں پیتے۔ شہر سے کچھ دور جاکر

ایک بڑے ہی پُر فضا سے مقام پر ہم لوگ پہنچے اور ٹولیوں میں بٹ گئے۔ میرے گروپ میں کچھ عورتیں اور مرد ہر عمر کے تھے۔ ٹین کے بند ڈبوں میں مختلف قسم کی ہلکی اور تیز شراب بھی تھی۔ جب دور چلا تو لوگوں نے مجھ سے بھی پینے کا اصرار کیا۔ ہم نے انہیں بہت سمجھایا کہ ہم شراب نہیں پیتے۔ چند خواتین نے جن سے میری بڑی بے تکلفی تھی ایک ڈبہ کھول کر میری طرف بڑھایا کہ چلو یہ شراب نہیں ہے۔ اس میں برائے نام الکوحل ہے۔ جانے کیا سوچ کر میں نے ڈبہ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میرا پروفیسر دوڑتا ہوا آیا۔ وہ فرنچ میں کہہ رہا تھا کہ زہرا اس میں الکوحل ملا ہے اسے نہ پینا پہلے تو میری سمجھ میں بھی نہ آیا کہ ہوا کیا۔ اس نے آتے ہی ڈبہ میرے ہاتھ سے لیکر دور پھینک دیا اور اپنے ساتھیوں پر ناراض ہونے لگا کہ زہرا مسلمان ہے۔ یہ شراب نہیں پیتی ہے تو تم لوگوں نے اسے غلط کیوں بتایا کہ یہ شراب نہیں ہے۔ یہ پروفیسر بالکل نوجوان اور ظاہر ہے اپنے ماحول اور تہذیب کے رنگ میں رنگا ہوا تھا لیکن اسے میرے اصولوں کا کتنا احترام تھا۔ اس احساس نے میرا سر عقیدت سے اس کے آگے جھکا دیا۔ ہم مسلمان جو اپنے آپکو انسانیت کی ساری اعلیٰ اقدار کا محافظ سمجھتے ہیں جب بھی موقع ملتا ہے دوسری قوموں کے افراد کو وہ چیز کھلا دیتے ہیں جس کی وہ پرستش کرتے ہیں۔

گلاب کا پھول، پھولوں کا بادشاہ لیکن کانٹوں کی مصاحبت کے بغیر گزارہ نہیں۔ مانٹریال میں مختلف معاشرتی اور سماجی تجربوں کے دوران مجھے یہ بات خوب یاد آتی تھی کیوبک میں نسلی تعصب بہت زیادہ ہے۔ دراصل یہ کینیڈین کنفیڈریشن سے ہی علیحدہ ہونا چاہتا ہے۔ یہاں کی غالب آبادی فرانسیسی ہے۔ یہ لوگ اپنے کو باقی کینیڈین سے علیحدہ سمجھتے ہیں اور اپنا قومی تشخص برقرار رکھنے کے لیے باقی ملک سے تقریباً علیحدگی کے خواہاں ہیں ہم لوگوں کے نقطۂ نظر سے یہ رجعت پرست

علیحدگی پسند کہلائیں گے جیسا کہ ہم سابقہ مشرقی پاکستان کو کہتے تھے۔ پھر چوں کہ ان کی علیحدگی کی تحریک کی اصل بنیاد نسلی امتیاز ہے اس لیے یہ فاسسٹ رجحان بھی ہوا۔ حکومت کینیڈا ملک سے نسلی اور لسانی اختلافات کا خاتمہ کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کر رہی ہے۔ حکومت کی پالیسی MULTI CULTURISM کے تصور کو عوام میں مقبول بنانا ہے۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ کینیڈا کسی ایک نسل کے لوگوں کا ملک نہیں ہے۔ اس کی فلاح و بقاء کا دارومدار اسی پر ہے کہ یہاں مختلف ثقافتوں کو پھلنے پھولنے کا موقعہ دیا جائے تاکہ ہر رنگ و نسل اور ترک وطن کر کے آنے والے آزادی اور مساوات سے مل کر قومی و ملکی زندگی میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکیں۔ ظاہر ہے اس طرز فکر و عمل سے کیوبک کی علیحدہ قومیت کی تحریک کو ضرب پہنچتی ہے انہیں خطرہ لاحق ہے کہ چوں کہ اب باہر کے ملکوں سے آکر یہاں بسنے والوں میں زیادہ تعداد غیر فرانسیسیوں کی ہے اس لیے کچھ دنوں بعد فرانسیسی آبادی اقلیت میں تبدیل ہو کر رہ جائے گی۔

یہاں پر لسانی تعصب کا یہ عالم ہے کہ اسپتال میں بحیثیت مریض کے بھی اگر آپ نے ڈاکٹر سے انگریزی میں بات کر لی تو ایک تو یہ کہ سیدھے منہ جواب نہ دے گا اور دوسرے یہ کہ ساری ڈاکٹری ہدایت فرانسیسی زبان میں نہایت حقارت کے ساتھ دے گا اور آپ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم۔ بار بار دل میں دہراتے رہیں گے شروع شروع میں ظاہر ہے مجھے حالات کی سنگینی کا علم نہ تھا۔ فرانسیسی زبان سیکھنا تو میں نے شروع کر دیا تھا مگر مرحلہ ابھی ابتدائے عشق ہی تک پہنچا تھا کہ اتفاق سے میرے پاؤں میں موچ آگئی۔ اسپتال جا کر ڈاکٹر کو اپنی بپتا سنائی اور آپ یقین مانیئے اس نے میری بات سننے سے انکار کر دیا۔ کہا مجھ سے فرانسیسی میں بات کرو۔ میں انگلش نہیں سمجھتا یہ بات اس نے فرانسیسی میں کہی حالانکہ جس

طرح اردو بھلے یا بُرے ہندوستان و پاکستان کے گوشہ گوشہ میں سمجھی جاتی ہے وہی حال انگلش کا کینیڈا میں ہے۔ خیر صاحب دو چار الفاظ جو فرانسیسی کے مجھے آتے تھے ان کے ذریعہ اپنی تکلیف بیان کی اور اس سے ہدایت لی۔

اب پیر میں موچ کی بات آئی ہے تو بے غرض اور بے لوث انسانی خدمت کا ایک اور واقعہ بھی سُنا دوں۔ اس تجربہ کی یاد میرے دل میں ہمیشہ پھولوں کی خوشبو کی مانند بسی رہے گی۔ برف باری ہو رہی تھی۔ ہم گھر سے فرینچ اسکول جانے کے لیے نکلے۔ اسکول تو خیر پہنچ گئے۔ مگر کلاس تک جاتے جاتے برف پر پیر پھسل گیا اسی سلسلہ میں ہمیں اسپتال جانا پڑا تھا۔ پھر پیر میں پلاسٹر ہوا اور تقریباً مہینہ بھر بستر پہ رہنا پڑا۔ فرینچ پڑھنے کے لیے کیوبک کی حکومت ہم لوگوں کو الاؤنس دیتی تھی اور بیماری اور فرصت لینے پر یہ الاؤنس کٹ جاتا تھا جس کی ادائیگی بیمہ کمپنی کی طرف سے ہوتی تھی۔ مجھے یہ سب نہیں معلوم تھا۔ میرا ایک پروفیسر گھر پہ شروع میں کئی بار میری عیادت کو آیا۔ وہی انشورنس کلیم کا فارم بھی لایا اور میرے لیے کلیم وغیرہ کے لیے دوڑ دھوپ کر کے چیک لاکر دیا۔ یہ بھی بالکل نوجوان تھا۔ لیکن انسانی خدمت کے جذبہ سے سرشار۔ میری بے انتہا عزت کرتا تھا اور کہا اس نے کہ جب تک ہم چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوئے وہ خود میرے گھر آکر پڑھاتا تھا کہ میں کلاس میں پیچھے نہ رہ جاؤں۔ اس وقت اس کی ایک حسین سی انگریز بیوی اور دو پیاری پیاری بچیاں تھیں۔ افسوس کہ اس کا پتہ میرے پاس سے کھو گیا اور ہم دوبارہ کینیڈا گئے تو اس کا کھوج نہ لگا سکے۔

اتفاق سے ۱۹۷۵ء میں بھی ہم کناڈا میں تھے۔ خواتین کے عالمی سال کے عشرہ کا آغاز بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ ہر طرف عورتوں کے حقوق کے چرچے تھے۔ ان کی پسماندگی کا رونا تھا اور ان کی نجات اور آزادی کا مطالبہ۔ بڑی خوشی ہوئی اور اب بڑا سکون ہوا کہ چلو اب جب کہ دنیا کی ساری اقوام نے عورتوں کے مسائل حل کرنے کی ٹھانی ہے تو کچھ نہ کچھ مثبت انداز میں ہو ہی رہے گا۔ مشرق اور مغرب دونوں ہی جگہ کی عورت کا استحصال ہو رہا ہے مگر موجودہ دور میں ترقی یافتہ مغربی ممالک میں اس استحصال کا طریقہ کار بدل گیا ہے۔ جب کہ پسماندہ ترقی پذیر اور اکثر مشرقی ممالک میں صدیوں پرانے استحصالی طریقہ کار کو پھر سے چمکا کر عورت کے انسانی حقوق کی طرف بڑھتے ہوئے قدم میں بیڑیاں ڈالنے کی سازش ہو رہی ہے۔ تفصیل میں جائے بغیر ہم ابھی صرف اتنا کہیں گے کہ ہندوستان پاکستان اور اسی طرح کے دوسرے ممالک کی عورت جہالت بیہودہ اور ظالمانہ رسم و رواج اور قید و بند کی شکار ہے اور ترقی یافتہ مغرب کی عورت سرمایہ دارانہ نظام کی بدولت (جس کی بنیاد زیادہ سے زیادہ منافع کمانے پر ہوتی ہے) جنسی بے راہ روی کی طرف مائل کی جا رہی ہے تاکہ ان کی جنس اور جسم کے ذریعہ دولت بٹوری جا سکے۔ مشرق اور پسماندہ ممالک کی عورت کا مسئلہ غربت اور معاشی غلامی اور جہالت کا پیدا کردہ ہے۔ مغرب کی عورت کا مسئلہ جنسی تجارت کا پیدا کردہ ہے۔ مسئلہ دونوں کا سنگین ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس سنگین مسئلہ کا تجزیہ صحیح نہج پر ہو تاکہ حل کی مثبت راہوں کا تعین ہو سکے کہ اسی تعین پر انسانیت کے مستقبل کا انحصار اور اس کی بقاء کا دار و مدار ہے۔

ایک عام خیال یہ ہے کہ عورتوں کے مسائل دنیا کے باقی مسائل سے علیحدہ

نوعیت کے ہیں یا انہیں اگر بحیثیت عورتوں کے مسائل کے حل کر دیا جائے تو بس عورتوں کے لیے اس سرزمین ہی پر جنت کا دروازہ کھل جائے گا۔ یہ ایک سنگین غلط فہمی ہے اور اس غلط فہمی کا ازالہ بھی عورتوں کے حقوق کی ایک اہم کڑی ہے۔ عورتوں کی نجات پر امن عالم کا دارومدار ہے۔ عالمی غذائی مسئلہ ہو کثرت آبادی کا مسئلہ ہو، جمہوریت کی بقا ہو یا شہری زندگی کے فلاح و بہبود کے مسائل ہوں ان میں سے کسی کو بھی اس وقت تک حل نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ عورتوں کو سیاسی فیصلہ میں کلیدی حیثیت اور سماجی معاشی اقتصادی اور معاشرتی ڈھانچے میں بامعنی حصہ نہ ملے۔ یہ کہنا کافی نہ ہوگا کہ جن ملکوں میں عورتیں سربراہ حکومت رہی ہیں یا ہیں وہاں انہوں نے کیا تیر مار لیے کہ کوئی بھی فرد نظام حیات کو تنہا بدلنے پر قادر نہیں ہوتا۔ لیکن ساتھ ہی مجھے اس امر پر بھی یقین ہے کہ عورتوں کو جنسی آزادی یا میں تو کہوں بے راہ روی کے وہ حقوق یا سہولتیں دینے سے عورتیں آزاد نہیں ہوں گی جو آج مردوں کو حاصل ہیں بلکہ اس کا مثبت طریقہ یہ ہے کہ مردوں کے بھی جنسی آزادی کے حقوق پر پابندی عائد کر کے دونوں صنفوں کو ایک سطح پر کھڑا کیا جائے۔

آج کل مغرب میں بہت زیادہ اور ہمارے یہاں کسی قدر ابتدائی طرز پر صنفی عصبیت کو ختم کرنے کا مطالبہ شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ نعرہ یہ مطالبہ بڑا مثبت ہے بشرطیکہ ہماری قائد خواتین اس کے لیے جد و جہد کی جو راہ عام خواتین کے لیے متعین کریں ان کے سامنے منزل اور مقاصد واضح ہوں۔ میں نے اپنے یورپ اور امریکہ کے طویل قیام کے دوران وہاں کی ویمن لب کی عورتوں میں اس جد و جہد کا جو رجحان دیکھا ہے اس سے تو بڑی مایوسی ہوئی اور بے ساختہ دل سے دعا نکلی کہ کاش ہمارے اپنے ملک میں یہ مطالبہ تو بار آور ہو مگر اس مطالبہ کا رجحان مقصد اور منزل وہ نہ ہو جو یورپ امریکہ کی ویمن لب کا موجودہ دہائی میں ہے۔

عورتوں کی نجات ان کی آزادی اور حقوق کے چرچے کچھ نئے نہیں ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ پچھلے چند برسوں میں یہ تحریک وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی ہے۔ ورنہ بچپن سے برصغیر میں کان اس قسم کے شور سے آشنا ہو چکے تھے اور تب بڑی حسرت سے سوچا کرتے تھے کہ مغرب کی عورت آزاد ہے جب کہ مشرقی عورت اب تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور گھر کی چہار دیواری کے اندر مقید۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر عورتیں غلام ہوتی ہی کیوں ہیں؟ جب شعور نے ذرا پختگی حاصل کی اور مارکس اور دوسرے مفکرین کا مطالعہ کیا۔ عملی زندگی سے واسطہ پڑا تو یہ عقدہ بھی حل ہوا کہ معاشی انحصار اور جہالت غلامی کی پہلی کڑی ہوتی ہے۔ مغرب کی عورت تعلیم حاصل کرتی ہے نوکری کرتی ہے اس لیے آزاد ہے۔ پھر جب اپنے ہی ملک کے معاشی ڈھانچے کا تجزیہ کیا تو پتہ چلا کہ ماضی میں بھی اور آج بھی مردوں پر عورتوں کا معاشی انحصار صرف جاگیردار، سرمایہ دار اور متمول طبقہ کی عورتوں تک ہی محدود ہے۔ ورنہ غلام معاشرہ سے لے کر موجودہ سرمایہ دارانہ نظام تک ہر دور میں محنت کش مردوں کے ساتھ محنت کش عورتوں کا بھی وجود رہا ہے۔ عورتیں کھیتوں کھلیانوں سے لے کر کل کارخانوں تک میں مردوں کے دوش بدوش کام کرتی رہی ہیں اور کر رہی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ بھی سماجی طور پر مردوں کی محکوم اور بے جا سماجی سختیوں اور پابندیوں کا شکار ہیں۔

اصل معاملہ یہ ہے کہ عورتوں کا استحصال اس لیے ہو رہا ہے کہ زمانہ قدیم سے ہمارے معاشرے کی بنیاد استحصال پر ہے۔ عورتوں کا استحصال ہو رہا ہے صرف اس لیے نہیں کہ وہ معاشی طور پر مردوں کی دست نگر ہیں۔ بلکہ بنیادی طور پر اس لیے کہ آج کے معاشرے کی بنیاد ہی استحصال پر ہے۔ ہر قوم ہر طبقہ اور ہر فرد موقعہ ملتے ہی اپنے سے کمزور قوم، طبقہ، دوسری جنس اور دوسرے فرد کا استحصال کرنے کی تاک میں لگا رہتا ہے

جب ہم نے یورپ اور امریکہ کے دوران سیاحت عورتوں کی تحریکِ نجات اور ان کے حقوق کے تحفظ کی باتیں سنیں تو ہمیں شروع شروع میں بڑی حیرت ہوئی ارے یہ کیا؟ تو کیا خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا۔" کیا واقعی مغرب کی عورت آزاد نہیں ہے۔ بھلا آزاد ہونے کے لیے اور کیا چاہیئے؟ نہ تعلیم حاصل کرنے میں رکاوٹ نہ حصولِ روزگار پر پابندی نہ پردہ کی قیود و بندش نہ ماں باپ کی مرضی سے شادی لازمی! اور نہ رسم و رواج اور روایتوں کی سخت گیری۔ تب کچھ لوگوں سے ملے باتیں کیں سماجی کارکنوں سے رابطہ قائم کیا۔ پتہ چلا کہ مغرب کی عورت کے آزادی حاصل کرنے یا غلامی سے نجات حاصل کرنے کے مسائل بظاہر پہلے سے کم ہونے کے بجائے زیادہ سنگین اور شدید ہو گئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ پہلے ان کی نجات یا آزادی کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ انہیں مردوں کے مساوی سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی حقوق حاصل ہوں کہ عورتیں بھی انسان ہیں اور صرف صنف کی بنیاد پر انہیں کمتر حیثیت نہ دی جائے۔ بے شک انہوں نے ڈٹ کر اپنے حقوق کو پامال کرنے والوں کا مقابلہ کیا اور مشرقی عورت سے بہت پہلے بہت کچھ حاصل کر لیا۔ لیکن یورپ و امریکہ کی سامراج وادی ہمہ گیری اپنے جلو میں باقی جو لعنتیں لے کر آتی ہے اس میں "فرد ہر قسم کی پابندی سے آزاد ہو۔" قسم کی لعنت بھی ہے۔ یہ صرف عورتوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ مرد بھی اس کا شکار ہیں لیکن چوں کہ ہم یہاں پر صرف عورتوں کی باتیں کر رہے ہیں اس لیے انہی تک محدود رہیں گے۔ چنانچہ آج ویمن لبریشن تحریک عورتوں کی آزادی کی بدنام زمانہ تحریک ہو کر رہ گئی ہے اس تحریک نے اپنے ابتدائی ادوار میں عورتوں کے لیے بہت کچھ حاصل کیا۔ لیکن آج ان کے ماتھے کا کلنک بن کر رہ گئی ہے۔ اس کے قائدین میں بڑی بڑی دانشور خواتین کے نام آتے ہیں۔ مگر یہ وہ ہستیاں ہیں جو اپنے عورت ہونے پر نازاں نہیں بلکہ

شرمندہ ہیں۔ خود مغربی ممالک میں ایسے افراد ابھر کر سامنے آرہے ہیں جو کھلم کھلا نہ صرف اس تحریک کے اغراض و مقاصد پر اعتراض کرتے ہیں بلکہ اسے ننگِ انسانیت بتاتے ہیں۔ عورتوں کو بہت کچھ ہوشیار رہنا ہے کہ ان کی صنف کی نجات کا جو شعوری عمل اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا کہیں ویمن لب کی فرد کی آزادی اور حقوق سے متعلق غلط نظریات اور تصورات کی بدولت اس کا پہیہ بالکل الٹی طرف ہی حرکت نہ کرنے لگے۔ کیوں کہ آج صورتِ حال یہ ہے کہ FEMINISTS روز افزوں تعداد میں خود ضابطہ شادی کو فنا کر دینے کے در پے ہیں۔ شادی جو انسانی تواریخ کا قدیم ترین ضابطہ حیات اور خاندانی زندگی کا اہم ستون رہا ہے۔ لیکن ۱۹۵۰ء کے اواخر سے لے کر ۱۹۸۰ء کی آخری دہائی تک پہنچتے پہنچتے مغربی ممالک میں شادی کے تناسب میں زبردست کمی اور طلاق کی تعداد میں بے تحاشا اضافہ ہوا ہے لیکن ساتھ ہی اس رجحان اور تحریک کا ردِ عمل بھی یورپ اور شمالی امریکہ میں شروع ہو چکا ہے۔

۱۹۸۳ء میں ہم کیلگری میں تھے۔ وہاں کیلیفورنیا کی ایک خاتون میری میڈ سے ملاقات ہوئی۔ یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں لیکن ان کا فلسفہ حیات آج کی مغربی ویمن لب کی حامی عورت کے نظریہ حیات سے براہِ راست متصادم ہے۔ میری میڈ خاندان کو معاشرہ کی مختصر ترین اکائی اور اس کا سنگ بنیاد مانتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ خاندان کے تحفظ اور بقاء پر انسان کی خوشی اور کامیابی کا انحصار ہے۔ وہ مختلف مقامات پر گھوم کر لیکچر کے ذریعہ لوگوں تک اپنے خیالات پہنچاتی ہیں۔

ہماری خوش قسمتی سے کیلگری میں ہمارے دوران قیام میں وہاں میری لین کے خیالات کی اشاعت کے لیے جلسہ ہوا ہم تو ایسے مواقع کی تاک میں رہتے ہیں کہ ذاتی طور پر لوگوں سے ملنے اور ان کے خیالات جاننے کا موقعہ ملے۔ چنانچہ اگرچہ بہت کھلا لیکن پھر بھی ۲۵ ڈالر فیس دے کر ہم بھی ان کے لیکچر میں شامل ہوئے خیر

ہم تو شامل ہوئے سو ہوئے لیکن حیرت ناک امر یہ ہے کہ یہ فیس دے کر زبردست تعداد میں عورتیں اس لیکچر میں شامل ہوئیں اور حیرت پر حیرت یہ کہ حاضرین میں زیادہ تعداد نوجوان اور جوان عورتوں پر مشتمل تھی۔ چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔"

میری زبان پر بار بار آ رہا ہے۔ بھلا جو عورتیں ویمن لب کے نام پر اپنی جسمانی عورت پن ہی سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی جد وجہد کر رہی ہیں۔ وہاں ایک ساٹھ سالہ عورت کی انتہائی رجعتی باتیں لوگ گرہ سے دام خرچ کر کے سنیں تعجب کا مقام نہیں تو کیا ہے۔ آپ بھی سنیں میرین کا کیا کہنا ہے۔ میرین کے فلسفہ حیات میں عورت کے لیے پہلے خدا کا درجہ آتا ہے پھر مرد اور تیسری اور کمترین حیثیت عورت کی ہے۔ یہ انتہا پسندانہ نظریہ حقوق انسانی کے علمبرداروں سے براہ راست تصادم ہے۔ لیکن میرین جیسی انتہا پسند خواتین کے اس ردعمل کو جنم دینے کی ذمہ داری موجودہ FEMINISTS تحریک کی نوعیت پر ہے۔ حقوق نسواں کے چوٹی کے علمبرداروں میں BETTY FRIEDON، GERMAINE GREER، BROWN MILLER اور SUSAN کے نام سرفہرست آتے ہیں۔

ذرا ۱۹۸۰ء سے پہلے اور بعد ان کے خیالات میں کیا تبدیلی آئی ہے اس کا ایک جائزہ لیتے ہیں تاکہ دوسروں کی غلطیوں سے کچھ سیکھ کر ہم مشرقی ممالک کی خواتین اپنے لیے کھاڑیوں سے بچ کر منزل تک پہنچنے کی راہ کا تعین کر سکیں بیٹی فرائڈن کی کتاب FAMINE MYSTIC ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی تھی اور GERMAINE GREER کی مشہور زمانہ FEMALE EUNUCH ۱۹۷۰ء میں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ امریکہ جانے سے پہلے ہمیں بالکل یہ اندازہ نہ تھا کہ آزادی نسواں کی تحریک دنیا کے متمول ترین ترقی یافتہ ترین اور آزاد ترین ممالک میں واقعتاً کیا حاصل کرنا چاہتی ہے ہم تو بچپن سے سنتے آئے تھے کہ مشرق کی عورتیں مردوں کی غلام ہیں اور مغرب کی

عورتیں آزاد۔ اب جو اتفاق سے ۱۹۷۵ء میں مانٹریال آئے تو چوں کہ عورتوں کے عالمی سال کی دہائی کا پہلا سال تھا۔ اخباروں اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے ذریعے کچھ اس سلسلہ میں جاننے اور سننے کا موقعہ ملا۔ پھر یونیورسٹی اور کالج میں بہت ساری پروفیسروں کے علاوہ نوجوان لڑکیوں سے باتیں کرنے اور ان کی امنگوں اور جذبوں کو سمجھنے اور ان کی تحریک کے مطالبات کو سمجھنے کا موقعہ ملا۔ ایک روز ہم اپنی ٹیچر جینٹ کو یہ سمجھانے کی کوشش میں بڑے انہماک سے مشغول تھے کہ اصل مسائل "مردوں کی برتری" کے اصول پر قائم معاشرے میں تو ہمارے مشرقی ممالک اور خاص طور پر ہندوستان پاکستان کی عورتوں کو درپیش ہیں۔ جہاں لڑکیوں کے ساتھ پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک یعنی لحد سے لحد تک بے انصافی کی جاتی ہے۔ ابھی اس بے انصافی کی تفصیل میں جانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ جینٹ نے گویا ہمیں انتہائی جاہل اور ایسا ناداں سمجھتے ہوئے جسے مسائل کی نشاندہی کرنے اور پرکھنے کا شعور نہ ہو، بیٹی فرائڈن کی کتاب FAMINE MYSSTIC (۱۹۶۳ء) اور جرمین گریر کی FEMALE EUNUCH پڑھنے کا مشورہ دیا تاکہ میرے ذہن کے بند دریچوں کو ذرا تازہ ہوا میسر ہو۔ واقعی ہم کو بڑا تعجب ہوا اور کافی اپنے آپ کو لعنت ملامت کی کہ ہم جو عورتوں کے حقوق کے بڑے حامی بنے چلتے ہیں ان اکابرین کی کتابوں سے پہلے کیوں نہ رہنمائی حاصل کی تھی سو فوراً بازار دوڑے اور دونوں کتابیں خرید لائے چند ہی صفحات FAMINE MYSTIC کے پڑھے ہوں گے کہ FEMALE EUNUCH کی طرف رجوع کیا۔ بمشکل دونوں کتابیں ختم کر پائے۔ اندازہ تو وہاں کی FEMINISTS تحریک کی نہج کا پہلے ہی ہو چکا ہے مگر باقاعدہ کن خطوط پر چل کر کس منزل پر پہنچنا ہے، یہ ان کتابوں کو پڑھنے کے بعد اچھی طرح معلوم ہو گیا۔

قارئین جو بیچارے ہمارے ان صفحات کو پڑھ رہے ہیں انہیں اکتاہٹ سے نجات دلانے کے لیے مختصراً انہیں بھی اپنے علمی تجربہ میں شامل کیے لیتے ہیں FEMALE EUNUCH میں عورتوں کے مسائل کا حل یہ پیش کیا گیا تھا کہ "اگر عورتیں اپنی حالت زار میں حقیقی سدھار کی خواہاں ہیں تو انہیں شادی کے جھمیلے اور بچوں میں پڑے بغیر لوگوں سے جنسی تعلقات قائم کرنا ہی ان کے مسائل کا واحد حل ہے۔

FAMINE MYSSTIC میں مصنفہ کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ شادی اور خاندان کے ذریعہ مردوں کو عورتوں پر تشدد کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ اس لیے عورتوں کو ان ذرائع تشدد سے نجات حاصل کرنی چاہیئے لیکن قارئین سے التماس ہے کہ اتنا جلدی معاشرہ اور خاندان کے مستقبل سے مایوس ہو کر خواتین کی صحت مند حقوق کی جدوجہد کا گلا گھونٹنے کی کوشش نہ کریں۔

۱۹۸۳ء میں جو ٹورنٹو کناڈا گئے تو قیام ایک سال سے زیادہ ہی رہا اس وقت تک BETTY کی کتاب SECOND STAGE اور GERMAINE کی SEX AND DESTINY مارکیٹ میں آگئی تھی۔ اب گریمائن کو یہ احساس ہوا ہے کہ جنسی آزادی کی تحریک نے عورتوں کے کاز کو بہت نقصان پہنچایا ہے اور یہ کہ خاندان کے شیرازہ کو منتشر کرنے سے عورتوں کے ہاتھ گھاٹے کا سودا ہی لگا ہے۔

FEMINISTS تحریک کے دوران شادی اور طلاق کی جانب مغربی اور امریکن عورتوں کے رویہ کا ذکر میں نے کہیں پر کیا ہے FEMINISTS کے مطالبہ پر اب امریکہ کی تقریباً ۴۸ ریاستوں میں طلاق غیر مشروط ہے یعنی بلا کسی جواز کے فریقین ایک دوسرے سے چھٹکارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ ویسے تو یہ بہت منصفانہ بات لگتی ہے کہ اب عورتوں کو جابر شوہروں کی زیادتیوں سے بآسانی نجات مل سکتی ہے لیکن عملاً اس کا فائدہ عورتوں کی بجائے مردوں کو ہوا ہے طلاق یافتہ عورتوں کا

معیارِ زندگی گھٹا ہے اور مردوں کا بہتر ہوا ہے۔ غیر شادی شدہ عورتوں کے علاوہ طلاق یافتہ ماؤں کے بچوں کو بھی عموماً صرف ماں کی کفالت میں رہنا پڑتا ہے۔ بجھیر طلاق کو اتنا آسان بنا دینے سے شادی کی پابندیوں سے بچنے کا رجحان عورتوں مردوں دونوں ہی میں زیادہ ہوا۔ میرے خیال میں اگر FEMINISTS کے علمبردار یہ مطالبہ کریں کہ بجائے طلاق کو اتنا آسان بنانے کے شوہر اور بیوی دونوں کے لیے اس کا حصول قدرے مشکل بنا دیا جائے اور دونوں پر مساوی شرطیں عائد کی جائیں اگر مردوں کی جنسی بے راہ روی کا مقابلہ کرنے کے لیے عورتیں جنسی آزادی کو نہ اپنائیں بلکہ صورت حال ایسی پیدا کی جائے کہ مرد بھی جنسی بے راہ روی سے باز رکھے جائیں تو زیادہ بہتر صورتِ حال پیدا ہو سکتی ہے۔

ہم اسے مغرب کا نقطۂ نظر کہہ لیں یا ترقی یافتہ معاشرہ کا المیہ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج دنیا کو زبردست تہذیبی بحران کا سامنا ہے۔ ایسا بحران جس کے مقابلے میں ہمیں درپیش معاشی اور سیاسی بحران بے وقعت ہیں۔ انفرادی آزادی کی کوشش نے سماجی تنظیم کے ہر روایاتی تصور کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ شادی جسے برصغیر کے ہم جیسے قدامت پرست اب تک ایک لازمی ضابطہ حیات سمجھتے آئے ہیں۔ مغربی ممالک میں عملاً ایک نہایت ہی ضمنی رسم کی حیثیت رکھتا ہے اور اکثر لوگ تو اس رسمی معاہدہ کی ضرورت یا اہمیت کو بھی نہیں مانتے ہیں۔ ایسے بچوں کی تعداد ریاستہائے متحدہ میں تشویشناک حد تک بڑھتی جا رہی ہے جو صرف واحد والدین کی سرپرستی میں پل رہے ہیں ایک اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۷۰ء کی دہائی میں پیدا ہونے والے بچوں کی ایک تہائی کے مقدر میں صرف واحد والدین کی سرپرستی ہے۔ والدین اور بچوں کے درمیان محبت و شفقت قربانی و اعتماد کی فضا میں پنپنے والے تعلقات استوار ہی نہیں ہو پاتے۔ قانون کے ذریعہ تو والدین اور بچوں کے تعلقات کو ملک بدر نہیں کیا گیا۔ مگر انفرادیت اور شخصی آزادی کے نام پر یہ ساری بیش بہا پرانی اقدار یکسر ختم ہو رہی ہیں۔ جن پر اب تک ہماری خاندانی معاشرتی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر ہوتی رہی ہے۔

کناڈا اور امریکہ میں حکومت کی جانب سے ایسے بہت سے ادارے قائم ہیں جہاں بچوں کو ان کے والدین کی زیادتیوں سے بچانے کے لیے پناہ دی جاتی ہے والدین کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنے بچوں کو کسی نافرمانی یا سرکشی پر سزا دے سکیں۔ بچوں کو اپنے اس حق کا علم رہتا ہے کہ اگر کوئی ماں باپ انہیں سزا دیں تو وہ فون کر کے پولیس کو اپنی مدد کے لیے بلا سکتے ہیں اور اپنے والدین کو اپنی سرزنش کرنے کے جرم میں گرفتار

کرا سکتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بچوں کو ماں باپ کی نگہداشت سے لے کر بہبود اطفال کی سرپرستی میں دے دیا جاتا ہے۔ ماں باپ کا نفسیاتی معائنہ اور علاج ہوتا ہے۔ محض اس قصور پر کہ انہوں نے بچے کو اس کی کسی غلطی پر مارا کیوں تھا۔ اگر والدین دوبارہ بچہ کو اپنی سرپرستی میں لینا چاہیں تو انہیں ڈاکٹر سے اپنی نفسیاتی اہلیت کی تصدیق کرانی ہوتی ہے کہ وہ بچہ کی دیکھ بھال کے اہل ہیں۔ یہ تجویز بھی وہاں کی اکثر ریاستوں کے زیرِ غور ہے کہ صاحب اولاد ہونے کے خواہشمند افراد کو بہبودی اطفال کے اداروں سے پوری تفتیش کرانے کے بعد یہ سرٹیفیکیٹ لینی ہوگی کہ وہ ذمہ دار والدین بننے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ قانونی طور پر اولاد کو یہ حق حاصل ہے کہ جوان ہونے کے بعد وہ اپنے والدین پر اس الزام میں مقدمہ چلا سکتے ہیں کہ ان کے والدین نے بچپن میں ان کی صحیح دیکھ بھال اور تربیت نہیں کی جس کی وجہ سے وہ دنیا میں کامیاب اور اپنی حسب منشا زندگی گذارنے کے قابل نہیں بن سکے۔ نیویارک کے ایک پچیس سالہ نوجوان نے اپنے والدین پر ۲۵،۰۰۰ ڈالر کے ہرجانہ کا دعویٰ کیا اس کے وکیل کی دلیل یہ تھی کہ اس کے مؤکل کے والدین نے جان بوجھ کر اس کی تعلیم و تربیت کی طرف سے غفلت برتی۔ چنانچہ اب بیمہ کمپنیوں کو کاروبار کا ایک نیا میدان ہاتھ آگیا ہے کہ اولاد کے ہرجانہ کے مطالبات کو پورا کرنے کے لیے والدین اپنا بیمہ کرائیں۔

دوسرا المیہ والدین اور اولاد کے آپس کے تعلقات کا جو امریکہ میں جنم لے رہا ہے وہ یہ ہے کہ اگر جوان اولاد اپنے والدین پر غیر مناسب دیکھ بھال کے لیے ہرجانہ کا دعویٰ کر سکتی ہے تو بوڑھے والدین کیوں نہیں اولاد سے اپنی دیکھ بھال کی قیمت ہرجانہ کی شکل میں وصول کر سکتے ہیں کیوں کہ آخر انہیں بھی تو اولاد کو پالنے پوسنے کے سلسلہ میں ذہنی پریشانی ان گنت بے خواب راتیں اور بے شمار دوسرے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ایک اور رُخ تصویر کا ہے۔ ننھے منے بچوں کو ان کے ماں باپ کے مظالم سے بچانے کے لیے بھی قانون موجود ہے۔ سوچنے اور تاسف کا مقام ہے کہ بچہ کو اگر والدین کے مظالم ہی سے تحفظ کی ضرورت پڑ گئی تو اس بدنصیب کو تحفظ اور اعتماد ملے گا کہاں؟ ماں کی آغوش میں محبت نہ ملی تو عوام کے ٹیکسوں کے پیسہ سے نوکر رکھے ہوئے لوگوں سے کیا یہ خریدی جا سکے گی؟ اگر بچہ یتیم و لاوارث ہو تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ فلاحی ریاست اس کی دیکھ بھال اور نگہداشت کرے۔ تاہم حکومت اپنے فلاحی اداروں کے ذریعہ صرف بنیادی مادی ضروریات زندگی ہی مہیّا کر سکتی ہے۔ جذباتی آسودگی اور بے غرض توجہ کی فضا جو ایک بچہ کو صحیح معنوں میں انسان بنا سکتی ہے وہ صرف ماں کی گود اور باپ کے سایہ تلے ہی مل سکتی ہے۔

مگر چوں کہ والدین کے مظالم سے بچوں کے تحفّظ کا قانون موجود ہے اس لیے ظاہر ہے اس کی ضرورت بھی محسوس کی گئی ہو گی یعنی آج کے مہذب و متمدن اور خوشحال مغربی معاشرہ میں اکثر بچوں کو ماں باپ کی اتنی نظر عنایت بھی نصیب نہیں ہے کہ وہ اپنے گھروں میں والدین کے زیرِ سایہ پرورش پا سکیں۔ ایک بات یہ یاد رکھنے کی ہے کہ چند سالوں سے خود مغرب میں بھی کچھ سمجھدار اور سنجیدہ قسم کے لوگ اپنے معاشرے کے روز افزوں ناسوروں سے تلملا اٹھے ہیں اور اب سماجی سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگ اور معاشرتی علوم و مسائل کے ماہرین باقاعدہ اس تحقیق اور کھوج میں لگے ہوئے ہیں کہ آخر یہ مغربی اور امریکی معاشرہ اُوپر سے لے کر نیچے تک انتشار، ابتری، بے راہ روی اور یاسیت کا شکار کیوں ہے۔ منجملہ دیگر اسباب کے جس کا تذکرہ آگے آئے گا ایک وجہ جس پر اکثر لوگ متفق ہیں یہ ہے کہ چوں کہ جنسی تعلیم بہت کم عمری سے دی جاتی ہے اس لیے مخلوط اسکولوں کے بچے انتہائی کم عمری سے ہی عملاً جنسی تجربہ شروع کر دیتے ہیں۔ باقاعدہ تحقیقی سروے سے یہ بات ثابت ہے کہ جن اسکولوں

میں جنسی تعلیم نصاب میں نہیں شامل ہے وہاں پڑھنے والے بچے اس طرح کی بے راہ روی کا اتنے بچپن میں نسبتاً کم شکار ہوتے ہیں۔ بہر حال نتیجہ یہ ہے کہ اکثر تیرہ چودہ سال ہی کی عمر میں لڑکیاں جانے انجانے ماں بن جاتی ہیں۔ اب بچوں کی سرپرستی کرنے والا کوئی ذمہ دار باپ تو ہوتا نہیں ہے۔ ماں یا تو اپنا بچہ دوسرے کے حوالے کر دیتی ہے یا پھر اگر تھوڑا بہت پختہ عمر کی ہوئی تو ان کی پرورش کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ امریکہ میں واحد والدین یا سنگل پیرنٹ فیملی کا آج کل خوب چلن ہے۔ یہ سنگل پیرنٹ فیملی اس لیے نہیں سلطے کہ بچے کا باپ مر گیا ہے بلکہ اس لیے ہے کہ باپ نامعلوم ہے یا پھر ماں نے طلاق لے لی ہے۔ عام طور سے جو کمسن لڑکیاں ماں بن جاتی ہے وہ مالی مسائل سے تو کم ہی دوچار ہوتی ہیں کیوں کہ ایسی ماؤں کو حکومت بچہ کی پرورش کے لیے باقاعدہ ماہانہ الاؤنس دیتی ہے لیکن وہ اپنی جذباتی اور ذہنی توانائی کھو بیٹھتی ہیں۔ شدید اعصابی تناؤ کا شکار ہو کر وہ اپنے شیر خوار بچوں پر اتنے مظالم ڈھاتی ہیں جن کا ہم ترقی پذیر اور کم ذرائع والے ممالک کے رہنے والے تصور بھی نہیں کر سکتے۔ محض کتابوں اور خبروں کے پڑھنے سے ماں کے مظالم کی بات میری سمجھ میں نہ آتی تھی جب چند فلاحی اداروں کے کارکنوں سے ملے تو ان لوگوں نے چھوٹے بڑے ہر طرح کے بچوں کو مجھے دکھایا اور بتایا کہ کن کن غیر انسانی طریقوں سے ان کی مائیں انہیں اذیت دیتی تھیں۔ کبھی جذبہ انتقام سے مغلوب ہو کر اور کبھی محض ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خاطر۔

امریکہ میں نوجوانوں یعنی سترہ سال سے تیئیس سال تک کی عمر کے لوگوں میں خودکشی کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ ایک سروے کے مطابق اس عمر کے افراد میں تقریباً ۳۵ فیصد اموات کی وجہ خودکشی ہے۔ خودکشی کی کوششیں جو ناکام ہو جاتی ہیں وہ علیحدہ ہیں۔ ماہرین نے خودکشی کے اسباب پر تحقیقی سروے کے ذریعہ بشمول دیگر اسباب کے مندرجہ ذیل وجوہات کو بہت اہمیت دی ہے۔

"نوجوان نسل سخت ذہنی انتشار، جذباتی ناآسودگی اور احساس تنہائی و عدم تحفظ کا شکار ہے اور اس صورتِ حال کی ایک اہم وجہ روایاتی خاندانی زندگی کا شیرازہ منتشر ہونا ہے۔" آج کل تو مغربی معاشرہ کی حالت یہ ہے کہ وسیع تر معنوں میں بھی خاندان کی سرپرستی حاصل ہونا تو رہا ایک طرف، طلاق یافتہ یا غیر شادی شدہ ماؤں کی اتنی کثرت ہوگئی ہے کہ کم ہی خوش نصیب بچے ایسے ہیں جنہیں بچپن اور آغازِ شباب میں ماں باپ دونوں کی رفاقت حاصل ہو۔ ایک ماہرِ سماجیات کا خیال ہے کہ بچوں کی صحیح اور ذہنی طور پر تندرست نشوونما کے لیے لازمی ہے کہ ان کی ذہنی اور جذباتی وابستگی نہ صرف اپنے والدین سے بلکہ والدین کے والدین سے بھی قائم رہے تاکہ وہ اپنی اصلیت اور وجود کے نام و نشان کے لیے گم کردہ راہ نہ ہوں۔ انہیں یہ پتہ رہے کہ وہ ان لوگوں کے نام لیوا ہیں جنہوں نے ماضی میں ان کے لیے کچھ قربانیاں دی ہیں اور خود انہیں بھی ماضی کا قرض چکانا ہے۔ امریکہ کے نوجوانوں کی معاشرتی زندگی اس لیے بھی تباہ ہو رہی ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کے والدین خود اپنے ماں باپ سے بہت کم وابستگی رکھتے ہیں۔ ان سماجی محققین کا کہنا ہے کہ ایک اچھے صحت مند معاشرے کی تشکیل میں گرینڈ پیرنٹ بڑا عملی تعمیری کردار ادا کر سکتے ہیں: بچوں کے درمیان ان کی موجودگی سے بچوں میں فرض شناسی، بے غرضی، قربانی اور انسانی ہمدردی کے جذبات پنپتے ہیں۔ غرض کہ اپنے بچوں کی اولاد کی تربیت اور نشوونما میں گرینڈ پیرنٹ بڑا مثبت اور خوش آئند کردار ادا کرنے کے اہل ہیں۔

ان محققین کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر خاندان کی اکائی میں پچھلی نسل کے بوڑھے والدین کو بھی شامل کر لیا جائے تو طلاق کی شرح میں کافی کمی ہو سکتی ہے کیونکہ بوڑھے والدین ہرگز یہ پسند نہیں کرتے کہ ان کی اولاد میں طلاق ہو۔ اگر ان کو قابلِ تعظیم بزرگ سمجھ کر ان کی رائے اور مشورہ کو اہمیت دی جائے تو یہ بزرگ اپنی اولاد کو بہت کچھ

تجربہ اور دوراندیشی کا درس دے کر انہیں جذباتی اور جلد بازی کے فیصلوں سے باز رکھ سکتے ہیں۔

ایک امریکن نوجوان کے تاثرات سنیئے جو کہ ہمارے لیے گریبان میں منہ ڈال کر جھانکنے کا مقام ہے۔ ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا کہ " ہم لوگوں سے اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے اور الزام عائد کیا جاتا ہے کہ آج کا نوجوان زندگی کی اعلیٰ اقدار اور قابلِ قدر روایات سے اتنا بے بہرہ کیوں ہے؟ اور وہ آوارہ گردی اور مایوسی میں اپنا وقت کیوں ضائع کرتا ہے۔ اس طرح کے سوالات کرنے والوں اور ایسی سوچ رکھنے والوں سے میری غرض صرف اتنی ہے کہ اگر وہ دیانت داری کے ساتھ ہمارے اسکولوں کے نظامِ تعلیم اور ہماری نام نہاد خاندانی اور گھریلو زندگی اور جو تعلیم و تربیت ہمیں ملتی ہے اس کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ ہماری بے راہ روی کی ذمہ داری کس پر عائد ہوگی اور نوجوان نسل سارے الزاموں سے بری ثابت ہوگی۔ اسکولوں میں ہمیں طعنہ ملتا ہے کہ ہمیں فیملی میں کچھ نہیں سکھایا جاتا اور گھر میں، اگر ہمیں گھر نام کی چیز میسر ہوتی ہے تب ہم پر یہ بہتان تراشا جاتا ہے کہ ہم اسکولوں میں کچھ نہیں سیکھتے۔ لیکن ہماری فیملی ہے کہاں اور اگر کہنے کے لیے ہے بھی تو وہاں ہمیں خود غرضی، نفرت اور نفس پرستی کے علاوہ دیکھنے اور سیکھنے کو ملتا بھی کیا ہے۔"

اس ماحول میں پلنے والے نوجوانوں کا فلسفہ حیات اگر یہ ہو کر رہ گیا ہے کہ نیکی اور بدی، صحیح اور غلط اجتماعی نہیں بلکہ ہر شخص کا انفرادی معاملہ ہے۔ اس میں دخل اندازی کر کے کسی نوجوان کو اس بات پر آمادہ کرنا کہ وہ ایک خاص اخلاقی معیار کو اپنائے فرد کی آزادی پر حملہ ہے تو اس پر تعجب کی کوئی گنجائش نہیں لیکن افسوس کا مقام ضرور ہے۔ یہی فلسفہ مغربی نوجوانوں کا مذہب ہے اور یہیں سے ہر قسم کی بدعنوانیوں اور بے راہ روی کا آغاز ہوتا ہے۔

مغربی آزادی پسندوں کا خیال ہے کہ مشترکہ اخلاقی اقدار کا درس نہ تو تعلیم گاہوں میں دینا چاہیئے نہ گھروں میں۔ اجتماعی اخلاقیات کا وجود ننگ و نام انسانیت سمجھتے ہیں۔ ہر فرد کو اس کا فیصلہ اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق کرنے کی آزادی اور حق ہے کہ اس کے لیے کون سا طرزِ عمل صحیح ہے اور کون سا غلط۔ دوسرے الفاظ میں تہذیب اور تمدّن کی روح رواں اخلاقی اقدار اور بندشیں اجتماعی ضابطہ عمل نہیں بلکہ انفرادی پسند ناپسند کا سوال ہیں۔ اس نقطہ نظر کے حامیوں کے خیال میں اجتماعی سماجی ضابطے اور قوانین فرد کو پابند سلاسل کر کے اس کی شخصیت کو کچل دیتے ہیں صحیح اور غلط کا نہ تو کوئی پیمانہ اجتماعی قرار دیا جا سکتا ہے نہ فرد کو ان کے برتنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔

ایک ایسی سرزمین سے جہاں کے رائج معاشرتی تصورات اور طور طریقے ہماری اقدار سے نہ صرف مختلف ہوں بلکہ متضاد ہوں یکایک سمجھوتہ کرلینا بہت مشکل ہے ذہنی طور پر ہمارے جیسے لوگوں کو تو چھوڑیئے ہماری طرف کے نوجوان لوگ بھی جو اُس طرف جاتے ہیں دو تہذیبوں کے تصادم سے دوچار ہیں کم از کم مجھے تو سنگم کے آثار کہیں نظر نہیں آتے۔

ایک روز صبح کا اخبار پڑھتے پڑھتے ایک اعلان پر ہم نہ صرف چونک گئے بلکہ دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ کم از کم میرے لیے تو وہ خبر بم کا دھماکہ ہی تھی۔ خبر یہ تھی کہ McGILL یونیورسٹی (جو کناڈا کی ایک مایہ ناز یونیورسٹی ہے اور جہاں ہم ان دنوں پی ایچ ڈی کر رہے تھے) اسی روز شام کو ایک مایہ ناز طوائف کو مدعو کیا گیا تھا تاکہ وہ اپنے تجربات کا نچوڑ اور پیشہ کی فن کارانہ عظمت سے ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ کو ایک باعزت پلیٹ فارم سے متعارف کرا سکے۔

بے شک ہمارا معاشرہ طوائف کے تصور اور وجود سے پاک نہیں ہے لیکن ہم طوائف کی ذات سے نفرت کریں نہ کریں اسے غلط اور ناساعد حالات کی پیداوار ضرور سمجھتے ہیں۔ سماجی درد رکھنے والے اسے معاشرہ کا ناسور قرار دیتے ہیں۔ کچھ اسے خود اس کے اپنے وجود کا ناسور سمجھتے ہیں۔ دولت مند عیش پرست اسے گندہ

کھلونا سمجھتے ہیں. مارکسی نظریہ والے اس کے وجود کو سرمایہ داری نظام کی گھناؤنی پیداوار گردانتے ہیں. مگر توبہ کیجئے کیا ہم مشرقی اقدار کے پروردہ لوگوں کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی یہ خیال جنم لے سکتا ہے کہ عورت آزاد ہے اور اپنی روزی کمانے کے خواہ وہ طوائف کا پیشہ اختیار کرے خواہ استاد کا۔ کسی کو اس پر پابندی عائد کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اسی تصادم کی بات ہم نے شروع میں کی ہے۔ مشرقی اور مغربی اقدار کا تصادم۔

تاسف کا مقام ہے کہ یونیورسٹی کے وہ نوخیز طلباء جو والدین کی آنکھوں کا تارا ہوتے ہیں جو ملک کا روشن مستقبل ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں میں انسان اور انسانیت کی قسمت کی باگ ڈور ہوتی ہے اور جن میں سے اکثر اپنے آپ کی پرورش لوح و قلم کے لیے وقف کردیتے ہیں۔ اسی نسل کو پیغام دینے کے لیے یونیورسٹی میں VISITING پروفیسروں کے ساتھ ایک مایہ ناز طوائف کو بھی مدعو کیا جاتا ہے

دوسرے روز اس طوائف کی تقریر اخباروں میں شائع ہوئی۔ تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ عصمت فروشی دنیا کا قدیم ترین پیشہ ہے اور ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا رہا ہے۔ مزید یہ کہ دوسرے فنکاروں اور پیشہ وروں کی مانند ایک طوائف بھی معاشی خود مختاری شخصیت کا نکھار. کردار کی عظمت اور دوسری اعلیٰ خصوصیات حاصل کرسکتی ہے

چنانچہ جتنی بار بھی ہم امریکہ یورپ آئے ہر ریاست ہر شہر میں کچھ نہ کچھ سیکھا اور سمجھا. وہ کچھ جو اپنی زندگی کے طویل سالوں میں بہت ساری کتابیں پڑھ کر نہ سمجھ سکے تھے۔ انسان کی جان بچانے کے لیے یہاں بڑے جتن کیے جاتے ہیں مگر انسانیت کے بہتے خون کی کسی کو پرواہ نہیں ہوتی مجھے اب تک معلوم نہ تھا لفظ طوائف کا اطلاق مردوں یا کمسن بچوں پر بھی ہوتا ہے یا مننے بچوں سے عصمت فروشی کرائی جاتی ہے کہ ہم لوگ تو بچوں کی معصومیت اور پاکیزگی کی قسمیں کھاتے ہیں. ہمارے

یہاں تو یہ خیال رائج ہے کہ بچہ اس قدر معصوم ہوتا ہے کہ اگر عہد طفلی میں انتقال کر جائے تو والدین کی بخشش کا وسیلہ بنتا ہے وہاں صورت حال یہ ہے کہ CHILD PROSTITUTION کی لعنت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اب تو ایک ایسے مکتبِ فکر نے بھی جنم لیا ہے جو انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ یہ پرچار کر رہا ہے کہ ننھے منّے بچوں کے ساتھ جنسی فعل بالکل فطری اور صحت مند عمل ہے۔

ایک روز ٹورنٹو اسٹار میں خبر دیکھی کہ ”این نے اپنے دو بچوں کو باپ کی تحویل سے اغوا کر لیا۔“ اغوا کے لفظ سے تو ہمارے کان خاصے آشنا ہیں۔ ادھر کسی کے اغوا کی خبر سنی ادھر ذہن میں ایک مکروہ خبیث ہیولیٰ آ کھڑا ہوا۔ اغوا کنندہ جس کا کام بچوں، عورتوں اور مردوں کو اغوا کر کے انہیں معذور بنا کر بھیک منگوانا، عصمت فروشی کرانا یا دولت کمانے کی خاطر جرائم کرانا ہوتا ہے۔ ہمارے تصور میں بڑی ذلیل اور قابل گردن زدنی مخلوق ہے۔ لیکن جب مسائل نت نئے ہوں تو جرائم بھی نیا روپ دھار لیتے ہیں۔ سو اگر اپنے براعظم کی چار دیواری سے باہر ترقی یافتہ ممالک میں بھی جا کر ہم یہ فرض کریں کہ کسی بچہ کے اغوا میں لازماً کسی شیطان صفت درندہ کا ہاتھ ہے جس نے اسے ماں کی ممتا اور باپ کی پدرانہ شفقت سے محروم کیا ہے تو یہ ہمیشہ صحیح نہ ہوگا۔ امریکہ اور کناڈا میں بچوں کا اغوا کرنے والے اکثر حالات میں ان کی مائیں ہوتی ہیں۔ وہی مائیں جو ممتا کا پیکر ہوتی ہیں لیکن جو اپنی ذہنی جذباتی اور جسمانی آسودگی کی خاطر بچوں کو ان کے باپ سے محروم کر دیتی ہیں یا ان کے باپ ہوتے ہیں جنہیں اپنی ذات اپنی خوشی اور آسودگی اور تعیش کی فکر ہوتی ہے اور جو بچہ کو اس کی ماں سے محروم کر دیتے ہیں۔

کناڈا میں طلاق کی صورت میں عدالتی فیصلہ کے مطابق بچہ ماں یا باپ کسی

ایک کی تحویل میں دیا جاتا ہے لیکن یہاں کی عدالتوں، سرکاری اور نیم سرکاری سماجی بہبود کے اداروں کے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے کہ ان فیصلوں پر کس طرح عمل کرایا جائے کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس فریق کی تحویل میں بچہ نہیں دیا جاتا ہے وہ اسے اغوا کر لیتا ہے اور دوسرے فریق کو بچہ کی کوئی خبر نہیں ملتی۔ یہ اغوا کیوں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ اولاد تو جسم کا حصہ ہوتی ہے۔ ماں باپ دونوں کو بچہ سے محبت ہوتی ہے اور طلاق کی صورت میں بھی اولاد کی محبت اپنی جگہ رہتی ہے۔ یعنی بچہ کو اپنی تحویل میں لینے کے لیے ماں باپ دونوں ہی قانونی چارہ جوئی کرتے ہیں۔ عدالت بچہ اسی کے حوالے کرتی ہے جسے وہ بچہ کی مناسب پرورش کا اہل تصور کرتی ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ سال کے چند مہینے بچہ باپ کے پاس رہتا ہے باقی چند مہینے ماں کے پاس۔

جینٹ سے میری ملاقات بہت دنوں پہلے مانٹریال میں فرانسیسی اسکول جانے کے دوران ہوتی تھی اور ہم اچھے خاصے دوست بن گئے تھے۔ پھر عرصہ تک اس سے کوئی رابطہ قائم نہیں ہو سکا۔ پچھلے دنوں ہم مانٹریال گئے تو اس کا کھوج لگا کر رہے بہت پریشان حال تھی۔ شادی کے بعد شوہر سے نباہ نہ ہو سکا تو طلاق لے لی۔ عدالت سے چار سال کے بچہ کی تحویل تو جینٹ کو ملی لیکن سال کے اندر ہی باپ نے بچہ کو اغوا کر لیا۔ جینٹ نے تادم ملاقات نہ تو شادی کی تھی اور نہ کرنے کا ارادہ تھا کیوں پر گئے تو دوسرا موضوع چھڑ جائے گا۔ بہر حال وہ بچہ کی جدائی میں پاگل ہو رہی تھی۔ میرے سمجھانے پر کہ آج نہیں تو کل بچہ تمھیں مل جائے گا۔ کہنے لگی کہ "چند سالوں کے بعد اگر JANATHAN (اس کے بیٹے کا نام) ملے گا بھی تو کیا؟ نہ تو اسے مجھ سے محبت ہوگی نہ مجھے ماں کہہ کر پکارنے پر رضامند ہوگا۔"

جینٹ ہی نے مجھے بتایا کہ اس کی ایک دوست این ہے جسے پانچ سال کے بعد اپنے دو بیٹوں کا پتہ ملا۔ جنہیں ان کا باپ اغوا کر کے لے گیا تھا اور جواب اپنی ماں کے

پاس عدالتی کارروائی کے ذریعہ واپس آ گئے ہیں۔ ان بچوں کی عمریں دس اور گیارہ سال ہیں۔ لیکن بچے چونکہ باپ کے پاس زیادہ رہے اس لیے ماں کے پاس خوش نہیں ہیں اور واپس جانا چاہتے ہیں اور میرا دل بار بار جینٹ سے یہ پوچھنے کو مچلتا رہا کہ جینٹ تم لوگ اپنے بچوں کو اتنا پیار کرتی ہو تو کبھی یہ بھی سوچا کہ ان پیارے بچوں کی تعلیم و تربیت اور سب سے بڑھ کر جذباتی نشو و نما کیسے ہوگی جنہیں نہ ماں کا پیار پورے اعتماد سے مل سکتا ہے نہ باپ کی شفقت۔

خوش قسمتی سے ابھی تک ہمارا مشرقی معاشرہ ساحل ہی سے طوفان کا نظارہ کر رہا ہے لیکن جس تیزی اور اشتیاق کے ساتھ ہم اپنی معاشرتی زندگی میں بغیر سوچے سمجھے بین الاقوامی اقدار و اثرات کو اپنا رہے ہیں وہ بہت خوش آئند نہیں ہے۔ انسانوں کی جس نئی نسل کو وجود میں لانے کے ہم ذمہ دار ہیں انکا یہ حق ہے کہ ہم انہیں پروان چڑھاتے اور ایک محفوظ اور پُر امید مستقبل عطا کرنے کے لیے قربانی کریں اپنے جذبات کا گلا گھونٹیں اور مصائب برداشت کریں

ابھی پوری طرح بچوں کے اغوا کے مضرات پر غور بھی نہ کر پائے تھے کہ انکشاف ہوا کہ مہذب دنیا میں شکم مادر بھی قانونی تحفظ کے ساتھ کرایہ پر دستیاب ہو سکتا ہے اور ہو چکا ہے۔ اخباروں میں پڑھا کہ کچھ عرصہ قبل فلوریڈا کے ایک شخص نے اشتہار دیا کہ اسے ایک ایسی عورت کا رحم کرایہ پر دستیاب ہے جو بغیر بیوی بنے ہوئے اس کے بچے کو جنم دے۔ اس کے لیے دس ہزار ڈالر کی پیشکش کی گئی تھی۔ ٹورنٹو کی ایک بیس سالہ لڑکی نے اس پیشکش کو قبول کیا۔ اسے انجکشن کے ذریعہ حاملہ کیا گیا اور معینہ مدت کے بعد جب بچہ پیدا ہوا تو فلوریڈا سے اس کا باپ آ کر بچہ کو معاہدہ کے مطابق لے گیا

اخباری نمائندوں کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے کرایہ کی ماں نے بڑے رسان سے بتایا کہ اس بچہ کے لیے اس کے دل میں کبھی بھی مادری جذبات پیدا نہیں ہوئے تھے اس لیے کہ اس نے تو اپنا شکم کرایہ پر اٹھا دیا تھا۔

اور ہم سوچتے رہ گئے کہ ہم لوگ کتنے سادہ لوح تھے کہ ماں کی محبت کو لازوال اور غیر لیکاڈ سمجھتے رہے۔ مگر نہیں ہم سادہ لوح نہیں انسانیت کے تقدس کے پاسبان تھے۔ ماں تو ہر دور ہر ملک ہر مہذب میں مقدس اور ایثار و قربانی کا پیکر رہی ہے ماں اور بچہ میں تو خون کا رشتہ ہوتا ہے لیکن لاحاصل تحقیق، ریسرچ اور تجربہ کا جنون اس رشتہ کے تقدس کو پامال کرنے پر تلا ہوا ہے۔

حالات کو دیکھ کر، سن کر اور پڑھ کر ہم اپنے سفر کے تاثرات تو لکھ دیتے ہیں اور دل میں یہ جذبہ لے کر لکھتے ہیں کہ واپس وطن جا کر بتائیں گے کہ ہم نے کیسا ہیبت ناک خواب ملک سے باہر ترقی یافتہ ممالک کی سیر و تفریح کے دوران دیکھا ہے لیکن اس کا یقین نہیں ہے کہ ہم انہیں شائع کرانے کی اخلاقی ہمت اپنے میں پیدا کر سکیں گے۔ ڈر ہے لوگ ہمیں دقیانوسی اور عورتوں کے مفاد کی دشمن نہ قرار دیدیں۔

سنتے تو ہمیشہ سے آئے تھے کہ ہر چمکنے والی شے سونا نہیں ہوتی مگر سمجھ کچھ اور بیٹھے تھے۔ برصغیر پاک و ہند کی مٹی سے زندگی کا خمیر بنا۔ اب جانے بچپن میں انگریزوں کی غلامی کا اثر اور آزادی ملنے کے بعد بھی احساس کمتری یا کچھ اور، مگر واقعہ یہ ہے کہ اپنے دیش اور دیش والوں کی ہر ادا میں ہمیشہ نقص ہی نظر آیا اور ساتھ ہی امریکہ اور یورپ کے لوگوں کے کردار کی بلندی اور دیانت داری کے چرچے کانوں میں پڑتے تھے لیکن جب خود حالات سے واسطہ پڑا تو دور کے ڈھول سہانے والی کہاوت کی

صداقت میں کوئی شک وشبہ نہ رہ گیا۔ چھوٹی سی بات روزمرہ کی زندگی میں دیانتداری
اپنے معاشرہ میں ہمیشہ برائیوں کے ناسور ہی نظر آئے۔ رشوت کا زور ہوا تو ہندوستانی
پاکستانی مجرمے ٹھہرائے گئے۔ چوری اور جرائم بڑھے تو ہندوستانی پاکستانی معاشرہ
برائیوں کی جڑ لڑکوں نے پڑھائی کی طرف توجہ نہ دی تو یورپ امریکہ کے لڑکے
مثالی ٹھہرے۔ مگر جب یورپ اور امریکہ میں کافی کافی عرصہ رہ کر اپنی آنکھوں سے
سارا حال دیکھا تو طبیعت صاف ہوگئی۔ حقیقت عیاں ہوئی تو بھولا بسرا شعر
بار بار زبان پر آتا رہا کہ "بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا جو چیرا تو ایک قطرہ
خون نہ نکلا۔

پہلا انکشاف تو یہ ہوا کہ انسان بنیادی طور پر یکساں خصوصیات رکھتا ہے
خواہ اس کا تعلق کسی مذہب، قوم، رنگ و نسل یا آب و ہوا سے ہو۔ ہاں ماحول اور
تربیت کا اثر بیشک فیصلہ کن ہوتا ہے۔ مثلاً غیر صحت مند ماحول کا پروردہ خواہ
اس کا تعلق انگلینڈ سے ہو، نیویارک یا ٹورنٹو سے اگر اسے چوری، رشوت خوری
اور بے ایمانی کا موقعہ ملے گا تو وہ ضرور کرے گا۔ سابق صدر نکسن، ہالینڈ کی ملکہ
کے شوہر جاپان کے پرنس میگفٹ تو خیر بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ لیکن یہاں
لندن، امریکہ کناڈا میں تو ہم نے دیکھا کہ معمولی پایہ کی چوریاں، رشوت خوری اور
اقربا پروری بھی ناپید نہیں ہیں۔

یہ بات کوئی مجھ سے پاکستان میں کہتا تو مشکل ہی سے یقین آتا لیکن یہاں
حالت یہ ہے کہ ایک منٹ کو بھی مکان کا دروازہ کھلا نہیں چھوڑ سکتے۔ ہمیشہ یہ خدشہ
کہ کوئی بھی اور کسی وقت بھی موقعہ پاتے ہی اندر گھس کر لوٹ مار مچا سکتا ہے دروازہ
میں صرف اندر یا باہر سے قفل لگانے سے کام نہیں چلتا۔ بلکہ دوسرا تالا باہر نکل
کر کنڈی سے لگانا پڑتا ہے۔ کیونکہ عام تالا تو باہر سے آسانی سے کھل سکتا ہے

اگر اپارٹمنٹ بلڈنگ میں رہتے ہیں تو صدر دروازہ ہمیشہ مقفل رہتا ہے۔ عورتیں اور لڑکیاں رات کے وقت بھی جتنی آزادی سے ہمارے یہاں نکل سکتی ہیں وہاں بہت مشکل ہے۔ معمولی چوریوں کی بات چلی تو ایک دلچسپ واقعہ اور اپنی زندگی کا سمجھئے کہ انوکھا تجربہ یاد آیا۔ ہم ٹورنٹو دوسری بار گئے تھے۔ جس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں رہتے تھے۔ اس کے نیچے شاپنگ سینٹر تھا۔ ساتھ میں بچوں کے کھیلنے کا ایک چھوٹا سا پارک تھا۔ میں نے اپنے پوتے شارق کو جس کی عمر اس وقت تین سال کی تھی لیا اور شاپنگ سینٹر سے چار دستہ کاغذ، دو فائلیں اور کچھ بال پن وغیرہ خرید کر بچے کو لے کر پارک میں چلے گئے۔ گھر واپس آئے تو یاد آیا کہ سامان تو پارک ہی میں بنچ پر پڑا رہ گیا۔ چنانچہ الٹے پیروں واپس ہوئے تو صاحب سامان کا ہے کو اپنی جگہ ملتا۔ دس بارہ سال کی عمروں کے کئی بچے وہاں کھیل رہے تھے۔ چند تو مجھے دور ہی سے آتا دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ دو چار جو باقی بچے اور جو شاید اس چوری میں شامل نہ تھے اپنی ذہانت ہی سے میری آمد کا مطلب سمجھ گئے اور استفسار کے بغیر ہی بتایا کہ جو بچے ابھی بھاگے ہیں وہی آپ کا سامان اٹھالے گئے ہیں۔ ان کے گھروں کا پتہ بھی بچوں نے بتایا۔ خیر سامان تو بہت قیمتی نہ تھا مگر ہم جو ہمیشہ وہاں کے لوگوں سے جان وپہچان پیدا کرنے کی کوشش میں رہتے تھے۔ دوسرے روز ایک مکان پر پہنچے۔ ماں ہی نے دروازہ کھولا۔ مجھے اخلاق سے بٹھایا اور ظاہر ہے بچوں اور گھریلو مسائل پر آہستہ آہستہ بے تکلفی ہونے پر کافی باتیں ہوتی رہیں لیکن عرصہ تک ہم اس بحر تحیّر میں غوطہ کھاتے رہ گئے کہ یا اللہ کیا جرم اور قانون شکنی انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ یہ کھاتے پیتے، پڑھے لکھے گھرانے کے بچوں کی نیت اتنی معمولی سی چیز پر کیوں خراب ہوئی۔ ہم تو غریب دیش کے باسی ہیں۔ ہمارے بچے چھوٹی چھوٹی سہولتوں کے لیے ترستے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی ہم پریشان ہیں کہ ہمارے بچوں کا اخلاقی معیار گرتا جارہا ہے۔

امریکہ میں تعلیم کے اعلیٰ معیار کے بارے میں ہم ہندوستان پاکستان والوں نے تاثرات رکھے ہیں وہ یہاں برابر آتے رہنے اور حالات کا بغور جائزہ لینے کے بعد زیادہ تر خیال خام ہی ثابت ہوئے۔ بے شک سائنس اور علم و حکمت میں امریکہ اور دیگر مغربی ممالک نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ زمین تو زمین آسمان کی وسعتوں تک چھلانگ دی ہے اور اس حد تک کہ اب زمین پر بسنے والوں کے لیے عرصہ حیات اور عرصہ زمین دونوں تنگ ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن ایک مسئلہ امریکہ کے ماہرین تعلیم و اساتذہ اور بچوں کے والدین کو اتنا ہی پریشان کر رہا ہے جتنا کہ ہم جیسے ترقی پذیر ممالک والوں کو۔ یعنی ایک طرف تو اپنی اعلیٰ سائنسی علم کی ترقی کی مدد سے کتاب فطرت کے اوراق کو پلٹ کر وہ اس کے سارے اسرار و رموز سے واقف ہو رہے ہیں تو دوسری طرف عام انسانوں کے لیے معیارِ تعلیم اور معیارِ انسانیت جو مقصد تعلیم ہے روز بروز گرتا جا رہا ہے۔ یہ ایک ایسا تضاد اور تشویش ناک صورتحال ہے جس کا کوئی حل اب تک امریکہ والے نہ نکال سکے ہیں۔

جہاں تک ہمارے پاکستان کا سوال ہے ایک ترقی پذیر ملک ہونے کے ناطے جہاں ہم اور بہت سے بے شمار مسائل سے دوچار ہیں۔ وہیں تعلیمی مسائل کا بحران

بھی ہے۔ نئے نئے پرائیویٹ اسکول اور کالج کھلتے ہیں۔ مشکلات اور مسائل کا ہر دوسرے تیسرے روز از سر نو جائزہ لیا جاتا ہے۔ اساتذہ جدید تعلیم اور سائنٹفک طریقہ تدریس سیکھنے کے لیے ترقی یافتہ ممالک میں بھیجے جاتے ہیں لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات، یعنی اسکولوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم جتنی عام ہوتی جارہی ہے اساتذہ کی تعداد جتنی ہی بڑھتی جارہی ہے، پی ایچ ڈی کرنے والے جتنے ہوتے جارہے ہیں۔ معیار تعلیم اتنا ہی پست ہوتا جارہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ ڈگری یافتہ افراد کی تعداد میں اضافہ کے باوجود تعلیم یافتہ لوگوں کا فقدان ہوتا جارہا ہے آخر ایسا کیوں ہے اور آیا یہ مسئلہ صرف پاکستان اور ترقی پذیر ممالک ہی کو درپیش ہے یا ترقی یافتہ ممالک بھی اس سے دوچار ہیں۔

ہماری اپنی تعلیمی مشکلات اور مسائل کیا ہیں؟ سچ پوچھیے تو ابھی ہم ان کا صحیح تعین بھی نہیں کر پائے ہیں۔ ابھی تو یہ بنیادی سوال ہی حل نہیں ہو پارہا ہے کہ ہمارے بچوں کا ذریعہ تعلیم کیا ہو۔ ہماری نئی آزاد نسل کو اپنی مادری زبان میں تعلیم پانے کا بنیادی حق ہے یا وہ صرف غیروں کی زبان کے ذریعہ نصابی کتابوں کو رٹنے اور حفظ کرنے کے اہل بنائے جائیں۔ ملک کے عام لوگوں کی طرف سے یہ دانشمندانہ مطالبہ روز بروز زور پکڑ رہا ہے کہ بچے کو اس کی مادری زبان ہی میں تعلیم ملنی چاہیے کہ تعلیم حصول علم کے لیے کسی بھی زبان میں حاصل کی جاسکتی ہے۔ سرکاری اسکولوں میں ذریعہ تعلیم آج بھی اردو ہے۔ لیکن ایک مشکل پیدا ہوتی ہے۔ متمول طبقہ کے احساس برتری کی وجہ سے۔ انگلش میڈیم پرائیویٹ اسکولوں کی فیس ملک کا عام طبقہ ادا نہیں کرسکتا۔ اس لیے ان کے بچے سرکاری اردو میڈیم اسکولوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ ان باحیثیت لوگوں کے طبقاتی انا کو اس حقیقت سے بھی تسکین ملتی ہے کہ ان کے بچے بڑی بڑی فیس ادا کر کے انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتے ہیں اور

یہی وہ والدین وہ والدین ہیں جو ذریعہ تعلیم کے مسئلہ کو حل نہیں ہونے دیتے۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو میڈیم میں تعلیم حاصل کر کے بچہ جب اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جائے گا تو اسے مشکل ہو گی۔ یہ یکسر عذر لنگ ہے کہ ساری دنیا کے بچے جب اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جاتے ہیں تو بہت قلیل عرصہ میں تعلیمی مقاصد کے لیے وہاں کی زبان مثلاً فرینچ، جرمن، روسی زبان سیکھ کر اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر لیتے ہیں۔ دوسرا اہم متنازعہ مسئلہ ہمارے سامنے یہ ہے کہ ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم علیحدہ ہو یا لڑکے لڑکیوں کے تعلیمی ادارے علیحدہ علیحدہ ہوں۔ پھر یہ کہ تعلیمی ادارے میں اخلاقی اقدار کیا اور کس طرح سکھائی جائے۔ تعلیم بنیادی طور پر سیکولر ہو یا مذہبی۔ علاوہ ازیں معیارِ تعلیم کے روز بروز گرتے ہوئے معیار کو سہارا دینا، تعلیم بالغاں وغیرہ۔

سب سے پہلی بات تو یہ ذہن نشین کر لینی ہے کہ یہ حل طلب مسائل جن سے ہم دوچار ہیں کچھ ہمارے ہی لیے مخصوص نہیں ہیں۔ ہم ایک ترقی پذیر ملک ہونے کی وجہ سے اس احساس کمتری میں مبتلا ہیں کہ ہر کمزوری، ہر خامی اور ہر برائی ہماری قوم کے افراد میں موجود ہے اور یہ کہ امریکہ اور یورپ جیسے ترقی یافتہ ممالک نے ان مسائل کا حل پا لیا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ یقین کیجیے کہ ایسا نہیں ہے۔ میں نے یہ مضمون ۱۹۷۸ء میں ٹورنٹو میں لکھا تھا۔ محرک تھا نیویارک ٹائمز کے تازہ ترین شمارہ کا یہ آرٹیکل "امریکہ میں ناخواندگی"۔ جی ہاں چونکنے کی بات تو ضرور ہے لیکن ہے حقیقت کہ آج بھی امریکہ میں صحیح معنوں میں ناخواندہ افراد کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ باوجودیکہ امریکہ نے ناخواندگی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا عزم اور انتظام مدتوں پہلے سے کر رکھا ہے اور وسائل کی بھی ان کے پاس کمی کیا ہوتی افراط ہی ہے۔ پھر بھی وہاں کے عوام میں ناخواندگی کا مسئلہ بڑی سنگینی کے ساتھ موجود ہے۔ امریکہ میں ہر سال تقریباً ستر بلین ڈالر پبلک اسکولوں کو درس و تدریس کی ترقی و فروغ کے لیے حکومت کی طرف

سے دیئے جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی حالت یہ ہے کہ لاکھوں امریکن ایک اندازہ کے مطابق ہر پانچ میں سے ایک بالغ لکھنا پڑھنا اور جوڑ گھٹاؤ کی استعداد بھی نہیں رکھتا جو ایک جدید معاشرہ کے لیے لازمی سمجھی جاتی ہے۔

وہاں ہائی اسکول تک کی تعلیم لازمی اور مفت ہے۔ لیکن معیارِ تعلیم کا یہ عالم ہے کہ اکثر ہائی اسکولوں تک پڑھے ہوئے نوجوانوں کی علمی صلاحیت و استعداد تھرڈ گریڈ کے معیار سے زیادہ نہیں ہوتی۔ تعلیمی ترقی سے متعلق ایک سروے رپورٹ کے مطابق سترہ سال کی عمر کے لڑکوں کے گروپ کے زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جو ٹریفک ٹکٹ کی عبارت اور اس پر دی گئی تاریخ نہیں پڑھ سکتے۔ امریکہ میں اپنے کسی حق کی پائمالی پر متعلقہ شخص یا ادارے پر مقدمہ کر دینا بہت عام ہے۔ چنانچہ ہائی اسکول پاس شدہ ایک گریجویٹ نے حال ہی میں مقامی اسکول کے نظامِ تعلیم کے خلاف حکومت پر مقدمہ کر دیا۔ کیوں کہ وہ بیچارہ تیرہ سال اسکول کی لازمی ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی لکھنے پڑھنے اور ابتدائی جوڑ گھٹاؤ کی صلاحیت سے محروم رہا ہے لیکن ہر سال اسکول میں اسے اگلی کلاس میں ترقی ملتی گئی۔ یہی حال کناڈا میں بھی ہے کہ قانوناً ہر بچہ کو گیارہ یا تیرہ سال اسکول کے طالب علم کی حیثیت سے گزارنا ہے۔ پڑھنے نہ پڑھنے یا امتحان پاس کرنے کی بھی شرط نہیں ہے امریکہ کی فرم اور کمپنیوں کو پڑھے لکھے لوگوں کے بحران کی سخت شکایت ہے۔ ایک سروے کے مطابق نیویارک میں مختلف کمپنیوں کے مالکان بنیادی تعلیم کا ایسا پروگرام مرتب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جن کے مطابق وہ اپنے ملازمین کو ابتدائی مطلوبہ تعلیم دے سکیں۔ کہتے ہیں کہ علاوہ دوسرے سماجی و معاشی عوامل کی ایک بڑی وجہ معیارِ تعلیم کے گرنے کی یہ ہے کہ اب ہر بچہ خواہ اس میں پڑھنے کی لگن اور صلاحیت ہو یا نہ ہو لازماً اسے ہائی اسکول ختم کرنا پڑتا ہے جب کہ پہلے صرف

پڑھنے کے شوقین بچے ہی پڑھائے جاتے تھے۔ ظاہر ہے تھوک کے حساب سے جو نئی پیدا ہوگی اس کا معیار تو یقیناً گرے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ امریکہ میں ایسے نوکری کے خواہاں افراد بھی ہیں جو اپنی درخواست کا فارم پُر نہیں کر سکتے۔ انٹرویو میں جانے سے پہلے وہ اپنے داہنے ہاتھ میں پلاسٹر لگوا لیتے ہیں اور ساتھ میں پڑھے لکھے دوست کو لے لیتے ہیں۔ بہانہ یہ اچھا مل جاتا ہے کہ ہاتھ میں تو پلاسٹر چڑھا ہوا ہے اس لیے لکھ نہیں سکتے چنانچہ دوست فارم پُر کر دیتا ہے۔

امریکن جیسی قوم جس نے ایٹم کا تجربہ کر ڈالا۔ مریخ میں جہاز بھیج دیئے۔ اسٹار وار کی دھوم مچا کر ساری دنیا کا امن تہ و بالا کر دینے کے درپے ہے وہ اب تک ان ذرائع کو دریافت نہیں کر سکی جن کی مدد سے وہ اپنے سارے شہریوں کو خواندگی کا معجزہ عطا کر سکے حیرت کا مقام ہے۔

یہ ساری باتیں لکھنے سے میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے آپ کو یہ تسلی دے لیں کہ صاحب جب اتنے ترقی یافتہ ملک کا یہ خیال ہے تو ہم کس قطار و شمار میں ہیں۔ میں نے تو اپنی سیاحت کے مشاہدات اور تجربات کا ایک خاکہ پیش کیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہمیں اپنے ملک میں جو تعلیمی مسائل درپیش ہیں۔ ان کو تعمیری اور مثبت طریقہ پر حل کرنے کے لیے اپنی مخصوص ضروریات اور معاشرہ کے تہذیبی اور اخلاقی تقاضوں کو پیش نظر رکھنا چاہئیے اور حل یہ نہیں ہے کہ پہلے زمانہ میں جس طرح تعلیم دے کر ہم معیار تعلیم صرف چند لوگوں کے لیے بلند رکھتے تھے اب بھی انہیں گھسے پٹے طریقوں کو اپنائے رکھا جائے۔ حقیقت پسندی یہ ہے کہ زمانہ بدل چکا ہے۔ اقدار بدل رہی ہیں۔ ہمیں یہ فکر کرنی ہے کہ کہیں بدلتی ہوئی اقدار کے نام پر بغیر اقدار کے نہ رہ جائیں۔

اسی ضمن میں ایک لطیفہ بیان کرتی چلوں۔ یہ اصل میں تو لطیفہ نہیں ہے

مگر چوں کہ میرے ذہن پر اس نے لطیفہ کے اثرات مرتب کیے اس لیے میرے لیے اور شاید میرے قارئین بھی لطیفہ ہی کی حیثیت سے اس سے محفوظ ہوں۔ ۱۹۷۸ء میں جب ہم مانٹریال میں تھے تو معلوم ہوا کہ بس اسی سال نومبر میں صرف خواتین کی تعلیم و تربیت کے لیے کالج کھلنے والا ہے۔ یقین مانیئے جی دھک سے ہو کر بھلا ہم پاکستان میں تو عورتوں کی علیحدہ یونیورسٹی کے قیام کی مخالفت کرتے ہیں۔ اب جب راہبر ہی راہ زنی پر اتر آئیں تو ہم کہاں کے رہیں گے؟ خیر ہم نے تو بڑے اعتماد سے اس باوثوق ذرائع سے ملی ہوئی خبر پر سرے سے ہی یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ بھلا کناڈا کی ویمن لب کی دلدادہ خواتین کیسے یہ جنسی تعصب برداشت کرنے پر تیار ہو گئیں جب کہ ہمارے اپنے ملک میں بھی ابھی اصولی طور پر یہ مسئلہ طے نہیں ہو پایا ہے کہ مخلوط تعلیم جاری رہے یا نہ رہے اور کمال یہ کہ اس کالج میں عورتوں کے لیے خصوصی نصاب مرتب کیے جائیں گے۔ مگر جب ذرا تفصیل سے اس تجویز کا مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ اس کالج کا مقصد نہ تو عورتوں کو اعلیٰ تعلیم دینا ہوگا نہ انہیں پیشہ ورانہ ماہر فن بنانے کی سہولت مہیا کی جائے گی۔ بلکہ عورتوں کے اس کالج کا مقصد ان میں نظریاتی تبدیلی لانا ہوگا۔ وہ نظریاتی تبدیلی جس کی مدد سے وہ آزاد جنسی زندگی گذار کر مردوں کے غلبہ سے نجات حاصل کر سکیں۔ ہم پاکستان میں رجعتی حلقوں کی جانب سے عورتوں کی علیحدہ یونیورسٹی کے مطالبہ کے خلاف ہیں اسکے لیے ابھی یہاں عورتیں صرف حصول تعلیم کیلئے یونیورسٹی جاتی ہیں۔ ابھی وہ دور نہیں آیا ہے کہ خالصتاً عورتوں کی یونیورسٹی سے وہ علم کی ڈگری لینے کی بجائے مردوں کے خلاف محاذ آرائی کی ڈگری کے لیے کوشاں ہوں۔

عورتوں کی تحریکِ آزادی کا تواریخی طور پر تجزیہ اور جائزہ لینے کی کاوش میں ذہن کو پراگندہ کرنے والا ایک سوال جو متواتر میرے دل میں پیدا ہوتا رہا وہ یہ ہے کہ انسانی معاشرہ اور انسان کے بنیادی حقوق کے ارتقاء کے دوران ابتدا سے لے کر آج تک عورتیں بحیثیت ایک صنف کے کیوں زیادہ تر اپنے بنیادی حقوق سے محروم رہیں۔ ویسے تو زمانہ میں بے شمار انقلابات آئے۔ اگر ایک طرف مظالم و استبداد اور استحصال کے نت نئے تصورات اور نظاموں نے جنم لیا تو دوسری جانب انسانی وقار و عظمت حقوق اور انصاف کا بنیادی شعور بیدار ہوا اور انصاف پر مبنی معاشرہ قائم کرنے کی کاوش کا کارروان منزل کی جانب بڑھتا رہا لیکن آج بھی اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کے باوجود ہی نہیں بلکہ اس کے دوش بدوش عورتیں عالمی سطح پر عموماً اور ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک میں خصوصاً ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔

ویسے تو "عورت اور مرد" اپنی ذہنی اور دماغی صلاحیتوں کے لحاظ سے مساوی ہیں اور مساوی انسانی حقوق کی حق دار اس کا فلسفیانہ شعور آج سے ڈھائی ہزار سال پہلے کے غلام معاشرہ میں پیدا ہو چکا تھا۔ چوتھی صدی قبل مسیح ایتھنز میں عورتوں کو غلامی کی مانند شہری حقوق حاصل نہ تھے۔ ان کی

زندگیوں کی قدر و قیمت نہ صرف مردوں سے کمتر تھی بلکہ غلاموں کی مانند وہ جنس ملکیت تصور کی جاتی تھیں لیکن افلاطون ارسطو جیسے اساتذہ علوم و فنون کا کہنا تھا کہ عورتوں کو مردوں سے کمتر سمجھنا یا ان کے انسانی حقوق کو محدود کرنا ساری انسانی برادری کی تذلیل اور دنیا کی نصف آبادی کی صلاحیتوں کو برباد کر دینا ہے۔ افلاطون نے جس مکمل نظریاتی ریاست کا تصور پیش کیا۔ اس کے فلسفی حکمران کے لیے مرد یا عورت ہونے کی تخصیص نہ تھی۔ افسوس کہ افلاطون کی غیبت پرستی صرف نظریہ کا روپ دھار کر رہ گئی۔ ورنہ شاید آج کی دنیا دونوں صنفوں کے تعاون اور اشتراک سے آگ اگلنے کی بجائے امن وامان، محبت و آشتی کا گہوارہ ہوتی لیکن یوں ہوتا تو یوں ہوتا اس پر کیوں وقت کا زیاں کریں۔ ابھی تو ہمارا مقصد موجودہ جائزہ سے صرف یہ ہے کہ، کیا ہوا۔ اور ہوا یہ کہ وہ دور آیا جب زر زمین کے ساتھ زن کو بھی سارے فتنہ کی بنیاد قرار دیا گیا۔ ایسا ہونے کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ انسانی معاشرہ ابتدا ہی سے استحصالی بنیادوں پر منظم ہوتا رہا۔ عورت چونکہ جسمانی طور پر مردوں سے کمزور ہے اس لیے اس دور میں جب جسمانی طاقت ہی برتری کا پیمانہ ہوا کرتی تھی۔ عورت کو طاقتور صنف کا محکوم اور زیرِ دست بننا پڑا۔

عورتوں کی تحریک مساوات و نجات کے آغاز کا تواریخی طور پر تعین کرنا اسی طرح ناممکن ہے جس طرح یہ حتمی تعین کرنا ناممکن ہے کہ ظلم و ناانصافی اور حاکمیت کے خلاف حکم عدولی کا آغاز کب ہوا۔ بہرحال عورتوں کے انداز مزاحمت نے کئی تواریخی روپ دھارے۔ سترھویں صدی کے یورپ میں مذہب اور سماج کے مروجہ طرزِ عمل کے خلاف چند عورتوں نے انفرادی طور پر احتجاج کیا۔ ان میں ANNE HUTCHISON اور MILDRED وغیرہ کا نام سرفہرست آتا ہے۔ ان لوگوں نے چرچ اور آسمانی کتابوں پر صرف ایک صنف یعنی مردوں

کی اجارہ داری کے خلاف احتجاج کیا۔ ANNE نے مسیحی عقائد کی بنا پر معاشرہ میں سیاسی اور سماجی سطح پر امتیازی سلوک اور مردوں کے برتری کے نظریہ کے خلاف علم بغاوت اٹھایا۔ اس کی پاداش میں انہیں حکومت اور چرچ دونوں کے عتاب کا نشانہ بننا پڑا۔ میں نے تو یہاں پر صرف ان دو خواتین کا ہی نام اختصار کی خاطر لکھا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے پہلے بھی ایسی عورتوں کے نام کافی تعداد میں ملیں گے جنہوں نے صنفی تعصب اور استحصال کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن ANNE وغیرہ کا نام زیادہ اہمیت اس لیے حاصل کر گیا کہ جن سیاق و سباق میں اور جس انداز سے ان چند خواتین نے مسلمہ حاکمیت سے "ٹکراؤ" لیا اور احتجاج و مطالبات کیئے وہ ایک بالکل ہی نئے طرز فکر اور طرز عمل کا حامل تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ سترھویں صدی عیسوی میں فطری دلائل انصاف حقوق آزادی نجات وغیرہ جیسے نظریات لوگوں میں پھیل رہے تھے اور لوگ انہیں قبول کر رہے تھے ANNE اور MILDRED وغیرہ اسی وسیع تر انقلابی لہر سے متاثر ہو کر اس کا سبب بنیں۔

ابتدائی سرمایہ داری کا فروغ انسانی تنظیم و اسباب و علل کی کھوج جن کا تعلق سائنس کے پیدا کردہ نئے تصورات سے تھا اور پیورٹن عقائد کے فروغ نے لوگوں میں تحریک پیدا کی کہ وہ بہت سارے شکوک و شبہات کے علاوہ قدیم عقائد کو بھی نئی روشنی میں پرکھیں لیکن ساتھ ہی یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے کہ لوگوں کا یہ ابھرتا ہوا انقلابی شعور صرف سیاست اور مذہب تک محدود نہ تھا بلکہ معیشت مفلسی، انسانی استحصال عورت مرد کے تعلقات والدین اولاد خاندان اور سماج کے بارے میں توجہ طلب سوالات اٹھائے گئے۔ یہ ایسے مسائل اور سوالات تھے جنہیں کنفیوشش ارسطو وغیرہ کے فلسفہ اور قدیم صحیفوں تعلیمات و

اساطیر اور روایات نے صدیوں تک انسانی ذہن کی رسائی سے پرے قرار دے دیا تھا۔ سترھویں اٹھارویں صدی میں نئی نئی سائنسی اختراعات اور خیالات و نظریات میں انقلاب آنے کی وجہ سے یہ مسائل بھی منظر عام پر آئے۔ اس کے پہلے بھی اکا دکا لوگ ان سوالات پر مشکوک ذہن کے ساتھ غور کرتے تھے لیکن ان قدیم اعتقادات اور روایات کے خلاف برملا بولنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اگرچہ مسلمہ اقدار کے خلاف جذبات پہلے بھی ابھرتے تھے۔ عہد وسطی کے معاشرے میں کہیں کہیں تو سماجی اور سیاسی بغاوت کی لہر اٹھتی بھی دکھائی دیتی ہے لیکن ان باغیانہ خیالات کے پیچھے منظم تحریک کے نہ ہونے کی وجہ سے استبدادی طاقتیں انہیں آسانی سے دبا دیتی تھیں۔ نشاۃ ثانیہ ہی سے عورتوں میں بھی شعور و آگہی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

منظم تحریک نسواں نے سترھویں صدی یورپ کے انقلابی نظریوں اور حالات کی کوکھ سے جنم لیا۔ اس تحریک میں بورژوازی متوسط اور محنت کش خواتین سبھوں نے انقلابی کردار ادا کیا۔ یہ وہ دور تھا جب جدید صنعتی عہد کی تشکیل ہو رہی تھی اور نئے انقلابی نظریات و رجحانات پنپ رہے تھے۔ اب انقلابی خیالات سے عورتیں بھی بحیثیت ایک سماجی گروہ کے متاثر ہوئیں۔ روشو جسے انقلاب فرانس کا بانی کہا جاتا ہے اور جس نے انسانوں کو فطری حقوق آزادی اور جمہوریت کا جدید شعور بخشا اس نے کہا کہ ''انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے''۔ لیکن روشو کے اس آزاد انسان میں عورتیں شامل نہ تھیں۔ بہر حال روشو نے آزادی مساوات اور بھائی چارگی کا نعرہ بھلے ہی صرف مردوں کو دیا ہو لیکن عورتیں اپنی صنف کی جاگرتی کیلئے ان نعروں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں اور مساوات کا مطالبہ کیا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ

نظام میں مساوات سے مراد صرف قانون کی نظروں میں برابری ہے۔ اور مساوات کا
یہ نظریہ سرمایہ دارانہ نظام کے فروغ کی اولین شرط ہے اور سترھویں صدی سے یہی
نظریہ رائج ہے چنانچہ قانون " مساوات اور آزادی " کے اصولوں کو اسی وقت تک
اپنے میں سموتا ہے جب تک کہ ہم لوگوں کی خصوصی غیر مساوی صورت حال جس سے
وہ دوچار ہیں اس کی طرف سے آنکھیں بند کیے ہیں۔ مساوات آزادی جیسی اصطلاحوں
کا مفہوم ان خاص تواریخی حالات کے ذریعہ متعین کیا جاسکتا ہے۔ جن حالات میں
یہ پیدا ہوئے مساوات اور آزادی کا نعرہ برژوائی انقلاب کا نعرہ تھا اور نئی طبقاتی
غیر مساوات کو یہ مساوات تسلیم نہیں کرتی۔ مساوات ایک مجرد تصور کے طور پر
ہر طبقہ کو ایک پیمانہ پر رکھتی ہے FRANK NUMAN کے مطابق اس سے
کم از کم مساوات ملتی ہے۔

یہ ہے آج کے مساوات کی خامیاں یا کمزوریاں۔ کہ یہ کمزور اور طاقت ور
صاحب ذرائع اور محروم سبھوں کو ایک سطح پر رکھ کر آزادی اور مساوات کا اطلاق
کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس مساوات اور آزادی کے نقطہ نظر کی خوبیاں
بھی ہیں۔ ابتدا میں جب مساوات کا برژوائی نعرہ پیش ہوا تو اس نے سارے
طبقات کی نمائندگی کی جو پہلے جاگیرداروں اور امراء کے تابع تھے۔ مساوات برژوائی
کا وہ نعرہ ہے جب وقتی طور پر اس نے سارے طبقوں کی نمائندگی کی تھی جب ابھرتا ہوا
برژوائی جاگیردارانہ اور امراء نظام کے خلاف جد و جہد کرتا ہے تو ابتدا میں یہ سارے
محکوم طبقات کی نمائندگی کرتا ہے۔ سارے مظلوم طبقات کی حمایت کی آواز بلند
کرتا ہے۔ ابتدا میں ایسا لگتا ہے کہ مساوات کا یہ تصور غیر طبقاتی اور ابدی ہے۔
مساوات برژوائی کا بلا شبہ ایک کارنامہ ہے اور انقلابی قوت کی حیثیت سے مختصر
عرصہ کے لیے اس نے سارے طبقات کی نمائندگی کی۔ مگر اسی مساوات نے دو

نئے مخالف طبقات کو جنم دیا سرمایہ دار اور محنت کش طبقہ۔

اب ہم آتے ہیں مساوات کے برژوائی نظریہ اور باشعور تحریکِ نسواں کے درمیاں تعلق پر مساوات کے تصور کی تواریخ اور تحریک نسواں تحریک دونوں کی ڈگر متوازی رہی ہے۔ تحریکِ نسواں کی ابتدا میں ہمیں برژوائی مساوات کی خوبیاں اور خامیاں دونوں ہی ملتی ہیں۔ سترھویں صدی انگلینڈ میں منظم تحریک نسواں نے جنم لیا۔ عورتوں نے اپنے آپ کو بحیثیت ایک منفرد گروہ کے تشخص کیا جنہیں نئے سماج کے فوائد سے یکسر بے بہرہ رکھا گیا تھا۔ سترھویں صدی میں تحریکِ نسواں کی رہنمائی متوسط طبقہ کی خواتین نے کی۔ اٹھارویں صدی اور انقلاب فرانس نے مساوات کے نظریہ کو تقویت بخشی۔ اس طرح تحریکِ نسواں بھی نظریہ مساوات کے تسلسل اور اس کے اتار چڑھاؤ دونوں سے گزری۔ تحریکِ نسواں شعوری اجتماعی تحریک کے طور پر انقلابی برژوائی تحریک سے متاثر ہوئی اگرچہ اس کا نصب العین بھی مجرد انسانی مساوات تھا جس کی اپنی کمزوریاں اور خوبیاں دونوں ہیں جاگیرداری کے خاتمہ اور سرمایہ داری کے آغاز پر سترھویں صدی انگلینڈ میں عورتوں نے اپنے آپ کو ایک سماجی گروپ کی حیثیت سے نئے معاشرہ کی برکتوں اور فوائد سے محروم پایا۔ چنانچہ نئی انقلابی تبدیلیوں کی بنا پر انہوں نے بھی آزادی اور حقوق کا مطالبہ کیا۔ نئے برژوائی مرد نے مطلق العنانیت کے خلاف آزادی اور مساوات حاصل کی۔ نئی برژروائی عورت حیران تھی کہ ان انسانی حقوق کا اطلاق اس پر کیوں نہیں ہوتا۔

سترھویں صدی عیسوی میں خاندان میں مرد کی حاکمیت کو MARY ASTEL نے بلا جواز قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر ریاست کا مطلق العنان ہونا انسانوں کے حقوق کے منافی ہے تو خاندان میں ایک جنس کی مطلق العانیت

کیسے برحق ہو سکتی ہے ؟ یا یہ کہ " اگر ہر مرد آزاد پیدا ہوا ہے تو ہر عورت محکوم
کیسے پیدا ہو گئی ؟" تحریکِ نسواں کے حامیوں نے نئے انقلابی سماج کی اقدار جن کے
مطابق صرف مرد آزادی اور مساوات کے مستحق تھے اور جاگیر دارانہ سماج کی اقدار
جہاں توہمات غیر عقلی رسم و رواج اور کٹھ حجتی کا دور دورہ تھا۔ دونوں کے خلاف
اپنی آواز بلند کی۔ ارسطو کے مطابق عورتیں پیدائشی طور پر مردوں سے کمتر ہیں۔
اور اس زمانہ میں یہ نظریہ بہت مقبول تھا۔ تحریکِ نسواں کے حامیوں نے مختلف
دلائل سے یہ ثابت کیا کہ ذہنی اور دماغی طور پر دونوں صنفوں میں کوئی فرق نہیں
ہے۔ صرف تعلیم اور مواقع کی کمی نے انہیں اپنی خداداد صلاحیت کو بروئے کار
لانے سے محروم رکھا ہے۔ میری ایسٹل MARY ASTEL نے مرد کی فوقیت اخذ
کرنے کے نظریہ کو بھی باطل قرار دیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اگر بالفرض آدم کی تخلیق حوا کے
پہلے ہوئی بھی تھی تو مرغ و ماہی اور دیگر جنگلی جانور بھی تو آدم سے پہلے اس کرۂ ارض
پر موجود تھے۔ بنابریں حضرت آدم پر ان ذی روح اشیاء کی برتری تو ثابت نہیں کی
جا سکتی۔ چنانچہ سترھویں صدی بجائے اس مفروضہ کے خلاف بغاوت کی تحریک
جنم لے چکی تھی کہ ذہنی اور دماغی طور پر عورتیں مردوں کے مقابلہ میں پس ماندہ
نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ عورتیں ایک علیحدہ سماجی گروپ کی حیثیت رکھتی ہیں اور
ان کی اپنی سماجی خصوصیات ہیں۔ تیسرے یہ کہ مرد ایک سماجی گروپ کی حیثیت
سے دوسرے سماجی گروپ یعنی عورتوں کو محکوم بناتا ہے اور ان کا استحصال کرتا
ہے۔ چوتھا اہم رجحان اس تحریک کا یہ تھا کہ حقوق نسواں کی تحریک کا آغاز مردوں
کی مخاصمت یا مخالفت سے نہیں بلکہ بحیثیت ایک گروہ کے ان کی سماجی حاکمیت اور
رسم و رواج کی پابندیوں کے خلاف ہو۔ پانچواں یہ کہ تحریک نجات نسواں کا
مقصد آزادی اور مساوات سے یہ ہے کہ دونوں صنفوں کو مساوی مواقع

حاصل ہوں۔ اگر یہ کہنا صحیح ہے کہ جو کچھ ایک مرد کر سکتا ہے عورت بھی کر سکتی ہے تو یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ جو کچھ ایک عورت کر سکتی ہے مرد بھی کر سکتا ہے۔ حالانکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں صنفوں کی طبیعت مزاج میں زبردست تفاوت ہوتا ہے۔ عورتوں میں مردوں کی بہ نسبت محبت اور قربانی کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے جب کہ مردوں میں عورتوں کے مقابلہ میں جسمانی محنت و مشقت برداشت کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے لیکن محبت اور قربانی کا جذبہ کسی کمزوری کی علامت نہیں نہ یہ ندامت کی بات ہے۔ ہاں اگر محبت اور قربانی کے نام پر عورت سے حقیقی زندگی کے مواقع حقوق اور مساوات چھین کر اسے چار دیواری کے اندر بند کر دیا جائے اور مردوں کے لیے سارے مواقع میسر ہوں تو یہ یقینی مساوات کی نفی ہے۔

۱۶۶۲ء میں ایک خاتون DUTCHES OF NEW CASTLE نے لکھا کہ مرد ہمیں گھروں میں اس طرح بند کر دیتے ہیں جیسے قبروں میں دفن کیا جاتا ہے ہم چمگادڑوں کی مانند جیتے ہیں۔ جانوروں کی طرح کام کرتے ہیں اور کیڑوں کی طرح مرتے ہیں۔ تحریک نسواں ابتدا میں سیاسی طرز پر منظم نہ ہو سکی۔ لیکن خاص خاص مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے باشعور عورتوں نے اپنے گروپ مرتب کیے مثلاً مطالعہ گروپ: اس طرح کے گروپ کا مقصد ایک تو عورتوں میں تعلیم کا پھیلانا تھا اور دوسرے یہ کہ ایسے گروپ کے ذریعے عورتوں کو باہم ملنے جلنے اور تبادلہ خیالات کا رابطہ میسر ہو۔ آج کل تحریکِ نسواں میں " SISTER HOOD" پر بہت زور دیا جاتا ہے یہ مطالعہ گروپ اسی SISTERHOOD کی ابتدائی شکل ہے MARY ASTEL طنزیہ لکھتی ہیں: "اب تک عورتوں میں اتنا اتحاد نہیں ہوا ہے کہ ان کا انقلاب آسکے۔ ابھی بس اتنی سی سمجھداری آئی ہے کہ اپنی سونے

کی زنجیروں سے پیار کرسکیں اور خواتین کے لیے نشست و برخاست کے باوقار انداز کو اپنا سکیں۔" خیر یہ تو خود عورتوں کی اپنی کوتاہی پر ایک طنز تھا۔ لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا گیا عورتوں میں بے چینی پھیلتی گئی۔ انہیں اپنی تنظیم اور یک جہتی کی ضرورت کا احساس ہونے لگا۔ اب انہیں یہ شعور بھی بتدریج ہونے لگا کہ مساوات اور حقوق حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ مل جل کر اپنے مسائل کا تجزیہ اور ان کا حل تلاش کرسکیں۔ چنانچہ عورتوں کے کئی گروپ بنے۔ ان مختلف گروہ میں آپس میں سیاسی اتحاد اور باقاعدہ رابطہ نہ تھا لیکن ان گروپوں نے ایک منظم تنظیم کی داغ بیل ضرور ڈالی۔

اکثر سترھویں صدی کی خواتین کی تحریک پر یہ تنقید کی جاتی ہے کہ یہ صرف ایک خاص (یعنی برژروائی) طبقہ کی عورتوں کی تحریک نجات تھی۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ عورتوں نے جب مساوات اور حقوق کا مطالبہ شروع کیا۔ تعلیم کا حق مانگا تجارت اور دوسرے پیشہ ورانہ میدان میں آنے کی سہولت مانگی تو اس زمانہ میں محنت کش عورتوں کے مطالبات نہ تھے اس کے باوجود محنت کش عورت کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش ضرور کی گئی۔ یہ تنقید اپنی جگہ درست صحیح لیکن اس حقیقت کو بھی مدِنظر رکھنا ہوگا کہ ایسا ہونا حالات کا لازمی نتیجہ تھا۔ جو عورتیں تحریکِ نسواں میں پیش پیش تھیں ان کا تعلق اس زمانہ کے انقلابی طبقہ یعنی برژروائی طبقہ سے تھا لیکن ان برژروائی خواتین نے عورتوں کے خلاف جن مظالم کی نشاندہی کی اس سے معاشرہ کی ہر عورت خواہ وہ محنت کش ہو خواہ برژروائی متاثر تھی۔ چنانچہ ان برژروازی رہبر خواتین کی آواز معاشرہ کے ہر عورت کی آواز تھی۔ ابھی میں نے وضاحت کی ہے کہ جب ایک انقلابی طبقہ پرانے نظام کو للکارتا ہے تو اس کی یہ للکار سبھی کچلے ہوئے طبقات کے لیے ہوتی ہے۔ خود آزادی

حقوق مساوات اور بھائی چارگی کی مانگ اگرچہ بزر وائی طبقہ کا مطالبہ اور ان کی فوری ضرورت تھی لیکن یہ ہر انسان کی مانگ تھی۔ اگر یہ کلیہ صحیح ہے تو عورتوں کی تحریک پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ اس زمانہ کے معاشرتی حالات کے پس منظر میں خواتین کی تحریک نے عام عورتوں کے مفاد میں مساوی انسانی حقوق اور آزادی کا مطالبہ کیا۔ جب سماجی ناانصافی کا مقابلہ کرنے کے لیے نئے نظریات جنم لیتے ہیں تو اس وقت کے تقاضوں کے مطابق یہ نظریے انقلابی ہوتے ہیں۔ یہ موجودہ سماجی حالات سے علیحدہ نہیں کیے جا سکتے۔ چنانچہ یہ تسلیم کرنا کرنا پڑے گا کہ دونوں صنفوں کے درمیان مساوات کا مطالبہ کرنے اور عورتوں پر سماجی مظالم ختم کرنے کی تحریک میں عورتوں نے صحیح معنوں میں انقلابی کردار ادا کیا۔ اگرچہ ان عورتوں کا تعلق بزر وائی طبقہ سے تھا۔ تحریکِ نسواں کے ابتدائی دور کی رہنما خواتین نے نظریہ آزادی اور مساوات کے نظریاتی اور عملی تضاد کو اچھی طرح محسوس کیا۔ اگرچہ ان کے پاس کوئی نظریہ وضاحت کرنے کے لیے اس وقت تک نہیں تھا کہ آخر عورتیں مظلوم سماجی گروپ کس طرح بنیں۔ انقلاب فرانس نے عورتوں میں اپنے گروپ پر ہونے والے مظالم اور ناانصافی کا احساس اور زیادہ شدت سے ابھارا۔ CONDORCET WOOL STONE وغیرہ عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں ان کے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کو زیادہ ہی شدت سے محسوس کیا۔ انہوں نے باضابطہ اصولی طور پر اپنے مطالبات کے حق میں دلائل پیش کیے CONDORCET نے لکھا: ”یا تو انسانی برادری کے کسی فرد کو حقوق نہ ملیں یا سبھی بلا کسی تخصیص کے اس کے مستحق قرار دیئے جائیں جو فرد دوسروں کے حقوق کے خلاف ہے اسے اپنے حقوق سے بھی دستبردار ہونا پڑے گا خواہ اس کا تعلق کسی جنس کسی رنگ و نسل، مذہب و ملت سے ہو۔“

لکھتی ہیں WOOL STONE "عورتوں کو معاشرہ میں کمتر درجہ دینے سے عورت کے ساتھ ساتھ پورے معاشرے کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ نسوانیت کا مطلب کمزوری جمود اور معاشی اور جذباتی انحصار پسندی سے تعبیر کرنا نسوانیت کا چھچھورا تصور ہے۔

سترھویں اور اٹھارویں صدی میں ایک طرف تو مساوات اور فطری حقوق کا حصول مردوں کے لیے لازمی قرار دیا جا رہا تھا اور دوسری جانب عورتیں اگر روایتی کمزوری اور نسوانی خصوصیات سے آزاد ہو کر انسانی حقوق کا مطالبہ کریں تو انہیں مردانہ خصوصیات کی حامل ہونے کا طعنہ ملتا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مساوات اور حقوق کے مطالبہ کے ساتھ عورت اپنی صنف کے لیے موردالزام نہ بنے اس کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے WOOL STONE نے کہا کہ ہمیں اپنی فکر میں تبدیلی کر کے ایسا تصور اپنانا ہوگا جو عورت اور مرد دونوں کے سماجی خصوصیات میں ہم آہنگی پیدا کرے WOOLSTONE کے مطابق عورتیں اس لیے معاشرتی طور پر محکوم نہیں کہ وہ کم اہلیت رکھتی ہیں بلکہ اس لیے کم اہلیت رکھتی ہیں کہ انہیں محکوم بنا دیا گیا ہے WOOL STONE نے عورتوں کے شعور اور مساوات اور حقوق کے مطالبہ کو ایک نیا سیاسی زاویہ نظر عطا کیا۔

وہ صرف نئے انقلابی سماج کی اقدار میں اصلاح کے لئے کوشاں نہ تھی بلکہ پورے معاشرتی ڈھانچہ کو بدلنا چاہتی تھی صرف معاشرتی پیوندکاری سے عورتوں کے ساتھ بے انصافی اور نامساوات کا مداوا WOOL STONE کے خیال میں ممکن ہی نہ تھا۔ انقلاب فرانس کے فوری نتائج تو عورتوں کے لیے کچھ خاص مثبت نتائج کے حامل نہ تھے لیکن اس کے اصولوں کی بنیاد پر عورتوں کی تحریک بہت کچھ حاصل کر سکتی تھی۔ اس بات کا احساس WOOL STONE

کو اچھی طرح تھا جو تعلیمی گروپ عورتوں کی تحریک کی ابتدا میں تشکیل دیئے جا رہے تھے وہ ان کی افادیت سے متاثر نہ تھی۔ اس جیسی بہت سی عورتوں کا خیال تھا کہ اس طرح صرف چند گنتی کی خواتین مستفیض ہو سکیں گی جب کہ طبقاتی طور پر عورتوں کو کچھ حاصل نہ ہو گا۔ اصل مسئلہ معاشرہ کو مکمل طور پر تبدیل کر کے نئے خطوط پر ڈھالنا ہے۔ عورتوں اور مردوں دونوں کو نئے انقلابی معاشرہ کی خصوصیات سے آگاہ کرنا اور تعلیم دینے کی ضرورت ہے تاکہ ایک منصفانہ سماج وجود میں آسکے۔ صرف تعلیم سے زیادہ آس لگانا بے سود ہے۔

آزادی، مساوات اور عورت کے حقوق پر گفتگو کرتے ہوئے ہم جان اسٹورٹ مِل کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اجمالاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ عورتوں کے حقوق اور مساوات سے متعلق مل کے نظریات و خیالات خاصے تعمیری اور مثبت اندازِ فکر کے حامل تھے۔ اس کے نظریہ مساوات نے عورتوں کی تحریک کو بہت کچھ اعتماد بخشا اور اب یہ تحریک فلسفیانہ مباحثہ سے گزر کر ایک منظم سیاسی تحریک کی شکل میں ابھر کر سامنے آئی اس کے باقاعدہ مطالبات تھے جن میں ایک اہم مطالبہ "مساوی حقوق" کی مانگ تھا۔ ویسے دیکھا جائے تو مساوات کے فلسفیانہ اور نظریاتی پہلو اور ان کی بنیاد پر منظم کی گئی سیاسی تحریک میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ فرق صرف اس بات کا ہے کہ ہم اہمیت محض نظریہ کو دیتے ہیں یا اس نظریہ کی مدد سے کچھ خاص مقاصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ عورتوں کے حقوق کے خلاف لکھنے والوں کے مطابق عورتوں کا مروجہ سماجی مرتبہ اور ان کی معاشرتی خصوصیات عین تقاضائے فطرت کے مطابق ہیں۔ مل نے اپنے مضمون "عورت اور محکومیت" (SUBJECTION OF WOMEN 1869) میں لکھا ہے کہ عورت کے بارے میں لوگوں کے مروجہ تصورات کا فطری ہونے سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہیں۔ یہ

اکثر غیر فطری، زبردستی اور کسی خاص مقصد کو حاصل کرنے کے لیے خاص حالات میں پیدا کی ہوئی زبردستی کی خصوصیات ہوتی ہیں جنہیں عورت کی فطرت کہہ دیا جاتا ہے۔ جو بھی طرزِ عمل مروجہ ہوتا ہے اسے لوگ فطری سمجھنے لگتے ہیں۔ ہر معاشرہ میں ان گنت صدیوں سے عورت کو مرد کا تابع بنا کر رکھا گیا ہے چنانچہ جہاں کہیں بھی اس سے انحراف کی بات کی جاتی ہے یا اس مروجہ طور طریقہ کو ختم کرنے کی تحریک شروع ہوتی ہے، لوگ اسے غیر فطری طرزِ عمل سمجھتے ہیں۔ مل نے جمہوریت اور عورتوں کے حقوق کی پائمالی کے بارے میں بھی بہت کچھ لکھا گیا۔ وہ صنعتی سرمایہ داری کے رجعت پرستی کا مخالف تھا اس کے خیال میں انسانی معاشرہ کا ماضی اور مستقبل دونوں ہی حال سے زیادہ بہتر ہے۔ عدل اور انصاف کا ایک نیا معیار اس کے پیشِ نظر تھا۔ اس کے نزدیک شجاعت اور محکومیت کی قدریں علیحدہ ہوتی ہیں۔ وہ اسے سماج کی تشکیل کی بات کرتا ہے۔ جہاں سارے افراد مساوی ہوں۔ لیکن وہ بھی مساوات اور حقوق کا صرف قانونی مطالبہ کرتا ہے۔ چنانچہ وہ بھی یہاں دھوکا کھا جاتا ہے حالانکہ ایک طرف وہ یہ بھی کہتا ہے کہ عورتیں مساوی حقوق سے اس لیے محروم ہیں کہ مردوں نے انہیں گھروں اور خاندان کی حد تک محبوس کر رکھا ہے۔

مساوات کا لبرل اور عملی تصور یہ ہے کہ عورتیں اور مرد بے شک ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لیکن مساوات کا تقاضا یہ ہے کہ ایک دوسرے سے بہت سی باتوں میں مختلف ہوتے ہوئے بھی انہیں مساوی مواقع ملیں کہ وہ اپنی شخصیت کی نشو و نما اور تکمیل کر سکیں۔ خصوصیات میں مختلف ہونے کی وجہ سے کسی کو مساوی مواقع سے محروم کر دینا جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سرمایہ دارانہ سماج میں مساوات صرف ایک طبقہ یعنی سرمایہ داری ہی کے لیے ہو سکتی ہے۔ محنت کش طبقہ، عورتوں کا طبقہ جو حالات یا رسم و رواج کا شکار رہی ان کے لیے اس معاشرہ میں مساوات قانونی تو ہو

سکتی ہے لیکن حقیقی نہیں۔ مساوات کو صحیح معنوں میں مساوات اور غیر طبقاتی بنانے کے لیے ایسا نظام چاہیئے جہاں فرد کو اس کی صلاحیت کے مطابق مواقع ملیں جہاں محروم طبقہ کو ایسی سہولتیں ملیں کہ وہ اپنی صلاحیتیں بروئے کار لاسکے یعنی محنت کش کو اپنی محنت کا منافع ملے اور عورتوں کو رسم و رواج کی پابندیوں سے چھٹکارا۔ عورتوں کی نجات کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک محروم اور پسماندہ طبقہ ہے کیا ترقی یافتہ اور کیا غیر ترقی یافتہ بحیثیت ایک گروپ کے دنیا کے ہر ملک میں عورتوں میں مردوں کی بہ نسبت مفلسی کی شرح زیادہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں قانونی مساوات ہے وہاں بھی دونوں صنفوں میں حقیقی مساوات کا فقدان ہے یہ فقدان معاشرہ کے رائج الوقت رسم و رواج کو ختم کرکے اور انقلابی بنیادوں پر اس کی تنظیم نو کرکے ہی دور کیا جاسکتا ہے۔

شروع شروع میں جب ایک دو بار باہر کے ملکوں میں گئے تو جہاں اور بہت ساری چیزیں دیکھنے اور سننے کو ملیں وہیں جنریشن گیپ کا چرچا بھی بہت سنا۔ ویسے یہ اصطلاح بالکل ہی انجانی نہ تھی۔ ہندوستان کے صوبہ بہار سے کراچی ہجرت کر کے جب آئے تو معاشرتی اور نوجوانوں کے مسائل کے سلسلہ میں اکثر یہ لفظ سننے میں آیا۔ لیکن تب ہم یہ سمجھتے تھے کہ غالباً علم نفسیات کی یہ کوئی خاص اصطلاح ہے اور چوں کہ ہم نے اس سائنس میں کوئی ڈگری نہیں لی ہے اس لیے ماہرین علم اس کا اطلاق جس طرح کرتے ہیں وہی ٹھیک ہوگا ہم اس کا مفہوم صحیح طور پر اس لیے بھی نہیں سمجھ پاتے تھے کہ عملی زندگی میں اور اصولی طور پر ابھی جنریشن گیپ کے وجود اور افادیت کو ہمارے معاشرے میں پیر جمانے کا موقعہ نہ مل سکا تھا۔ لیکن پچھلے سفر کے دوران جب ہم ایک دوست کے لڑکے کے یہاں مانٹریال میں ٹھہرے ہوئے تھے تو اس لڑکے کی باتیں سن کر ساتوں طبق روشن ہو گئے۔ وہ بچارہ خود پانچ سال سے وہاں رہ رہا تھا اور پریشان تھا کہ یہ "جنریشن گیپ" کا فاصلہ اس کے اور اس کے والدین کے درمیان اب تک کیوں پیدا نہ ہو پایا تھا۔ اس لڑکے کو اب تک یہ علم بھی نہ ہو پایا تھا کہ اس کے ماں باپ نے اسے والدین اور اصولوں کی اطاعت اور بزرگوں کی تعظیم کے جو درس

دیئے تھے ان کو برتنے سے فرد کے حقوق کی نفی ہوتی ہے۔ بہت دنوں کے بعد نوجوان نسل کے ایک لڑکے سے اپنے مطلب کی باتیں کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ چنانچہ بڑی رات گئے تک ہم دونوں یعنی پرانی اور نئی نسل (لیکن شاید دونوں میں سے کوئی بھی اپنی نسل کی نمائندگی رائج الوقت تصور کے مطابق نہیں کر رہا تھا۔) کے دو افراد اس جنریشن گیپ پر باتیں کرتے رہے۔ ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ آج کل نوجوانوں کے بہت سارے مسائل کی ذمہ داری بظاہر اس چھوٹے سے لفظ اور اس سے جنم لینے والے تصورات سے ہے۔ زیادہ تر کناڈا اور جہاں جہاں بھی اس طرف کے ترقی یافتہ ممالک میں گئے یہی دیکھا کہ چھوٹی ہی عمر سے بچوں اور والدین کے درمیان جنریشن گیپ کے نام پر قطبین کا ناقابلِ عبور فاصلہ قائم ہو جاتا ہے۔ بچے تیمری دور سے ہی ماں باپ سے یہ سمجھ کر باغی ہو جاتے ہیں کہ یہ لوگ پرانے اور دقیانوسی ہو گئے ہیں نئے ذہن اور اس کے مطالبات کو کیا سمجھ پائیں گے۔ بوڑھے والدین کی دیکھ بھال اور ان کے ساتھ سعادت مندی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ نئی نسل کو یہی سکھایا جاتا ہے کہ نوجوانوں اور عمر یافتہ افراد کے درمیان کی خلیج پاٹنے کا مطلب فرد کو اس کی شخصی آزادی سے محروم کر دینا ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا کچھ عرصہ پہلے تک جنریشن گیپ کا یہ مفہوم ہم لوگوں کے لیے انجانا تھا۔ ہماری تہذیب میں تو مختلف نسلیں انسانی ارتقاء کی ایک کڑی کی مانند موتیوں کی ایک مالا کے مانند ایک دوسرے میں ضم ہوتی ہوئی سمندر کی لہروں کے مانند رہتی ہیں۔ جوان بیٹوں کی تو بات چھوڑیئے جوان پوتے پوتیاں بھی دادا دادی کو ایک تجربہ کار شفیق بزرگ کی حیثیت دے کر ان کی عزت اور اطاعت کرتے ہیں۔ دوسری طرف بوڑھے بزرگ جوانوں پر ان کے دم خم اور ان کے خوش آئند مستقبل پر تکیہ کرتے ہیں۔

اپنے ملک میں تو ابھی ابتدائے عشق ہے لیکن مغربی ممالک میں ہم نے نفسیاتی مسائل اور نفسیاتی مریضوں کی وہ بہتات دیکھی کر بوکھلا اٹھے اور شک ہونے لگا کہ کہیں ہم بھی نفسیاتی مریض کناڈا میں آکر نہ ہو گئے ہوں جو جنریشن گیپ کے خلاف اتنا مواد اکٹھا کر لیا ہے لیکن یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ مغربی ممالک میں زیادہ تر نفسیاتی بیماریاں نوجوانوں میں پائی جاتی ہیں۔ ایک وجہ جس پر تقریباً سبھی سنجیدہ سوچ رکھنے والے متفق ہیں۔ وہ وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر نوجوان ماضی سے اپنے عزیز و اقارب سے اپنا ناطہ توڑ لیتے ہیں وہ اپنی ناؤ تنہا کھیتے ہیں۔ ناتجربہ کاری کے باعث زندگی کے سمندر کے اتار چڑھاؤ کا انہیں تجربہ نہیں ہوتا۔ جب ان کی کشتی سمندر کی تند لہروں کی زد میں آتی ہے کوئی جہاندیدہ نہیں ہوتا جو انہیں صحیح مشورہ دے سکے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اعصابی تناؤ اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ماہرین نفسیات اور سماجیات میں سے اکثر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ نوجوانوں کو کشاکش حیات سے نمٹنے کے لیے جہاندیدہ اشخاص کے تجربہ اور مشورہ کی آج بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی پہلے ہوا کرتی تھی۔ اب بھی وہ عزیزوں رشتہ داروں اور بزرگوں کی نظرِ التفات کے محتاج ہیں۔ چاند اور تاروں پر کمندیں ڈالنے کے باوجود بھی انسان کو اپنی رہنمائی کے لیے سماج اور معاشرہ کے بندھنوں اور اس کے ضابطوں کی ضرورت ہے۔ ان ضابطوں کی ضرورت ہے جن میں سے بیشتر کو ہم نے پچھلی چند دہائیوں میں فرسودہ اور فرد کی آزادی اور خوشی کی راہ میں زنجیر کہہ کر توڑ پھینکا ہے۔

ذرائع رسل و رسائل اور ابلاغ کی ترقی نے جغرافیائی سطح پر تو قطبین کے فاصلہ کو عبور کر لیا ہے۔ اب کوئی معاشی، سماجی، سیاسی، مذہبی غرض یہ کہ زندگی اور اس کے تمام تر پہلوؤں سے متعلق کوئی بھی پہلو ایسا نہیں ہے جسے ہم کسی خاص ملک کا مسئلہ کہہ کر نظر انداز کر سکیں۔ کیا ترقی یافتہ کیا پسماندہ سبھی ممالک کم و بیش ایک ہی

قسم کے ذہنی اور جذباتی بحران سے دوچار ہیں۔ چنانچہ ایک طرف تو دنیا کے انسان اتنا نزدیک آگئے ہیں دوسری جانب حالت یہ ہے کہ ذہنی اور جذباتی طور پر باپ بیٹا بھی ایک دوسرے کی پہنچ سے باہر ہوگئے ہیں۔ انسان کی اپنی تنہا ذات اس کے وجود کا مرکز و محور بن کر رہتی ہے۔ وہ اپنی ذاتی خوشی اور عیش و آرام سے لطف اندوز ہونے کے لیے جیتا ہے اور جد و جہد کرتا ہے لیکن جب بیمار پڑتا ہے جب جسمانی کمزوری غالب آتی ہے جب مسائل دوراں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب کبھی بدقسمتی سے "الٹی ہوگئیں سب تدبیریں" کے سے حالات درپیش ہوتے ہیں۔ اس وقت اسے کوئی ہمدرد و غمگسار نہیں ملتا اور تب وہ ایک ٹوٹا پھوٹا شکستہ اور شکست خوردہ انسان ہو کر رہ جاتا ہے اپنا خدا تیاگنے کے بعد ایک ناخدا کی تلاش میں بھٹکتا رہتا ہے۔

ناخدا کے تلاش کی بھی کچھ تفصیل ہو جائے۔ آج امریکہ اور کناڈا میں ہزاروں جعلساز قسم کے مذہبی فرقے سرگرم عمل ہیں۔ حکومتیں ان کی جعلسازی سے واقف ہیں لیکن ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں کہ ملکی قوانین کے "جملوں کی تشکیل" نے انہیں تحفظ دے رکھا ہے۔ ہر سال بے شمار نوجوان لڑکے لڑکیاں ان فرقوں میں اس لیے شامل ہوتے ہیں کہ تعیش و آرام اور انفرادی آزادی کے جس بظاہر پُرفریب ماحول میں وہ زندگی گزار رہے ہیں اس نے انہیں نہ صرف مایوس اور بیزار کر دیا ہے بلکہ وہ مسلسل ذہنی کرب کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں انہیں خاندان اور معاشرہ کا وہ تحفظ اور پیار نہیں حاصل جس کی ضرورت ایک توانا اور نارمل ذہن کے ابھرنے کے لیے ہوتی ہے چنانچہ مذہبی دھوکہ بازوں کے یہ ٹولے جذباتی آسودگی اور تحفظ میں سرگرداں نوجوانوں کو اپنے دام میں نت نئے پرفریب طریقوں سے اسیر کرتے ہیں۔ ایک سروے کے مطابق تین سے چار ہزار تک کے درمیان مختلف مذہبی ٹھگ امریکہ اور کناڈا میں کام کر رہے ہیں۔ موجودہ معاشرہ کے انتشار سے بیزار اور اعلیٰ انسانی اقدار کی تلاش میں سرگرداں نوجوانوں کو ان کے پیغام

میں بڑی کشش ملتی ہے کیوں کہ یہ مذہبی فرقہ ایک ایسی عالمی برادری کے قیام کا مژدہ سناتے ہیں جہاں امن محبت اور سکون کا راج ہوگا اور ہر قسم کے مسائل اور دکھ درد سے نجات۔ حقیقت میں یہ مذہبی فرقے ٹھگوں کے ٹھگ ہوتے ہیں۔ ان کا سردار یا سربراہ باہر کی دنیا میں تو پادری یا سنیاسی کے روپ میں جانا پہچانا جاتا ہے لیکن درحقیقت وہ شاہانہ اقتدار و اختیار اور دولت کا مالک ہوتا ہے اور انتہائی عیاشی کی زندگی گذارتا ہے۔ ایسے ہی ایک فرقے کا سربراہ سن سانگ مون ہے یہ شمالی کوریا سے امریکہ آیا ہے اور مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کر رکھا ہے۔ خاصا پڑھا لکھا ہے۔ سیاست کی سوجھ بوجھ فلسفہ کی تعلیم اور مذہبی معلومات کا اس کے شاطر ذہن نے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کا مشن ہے کہ ''دنیا کو فتح اور مسخر کرنا'' مون خود تو تعیش کی زندگی گذارتا ہے لیکن اس کے معتقدین کو راہبانہ طریقہ سے رہنا پڑتا ہے۔ ان معتقدین کی برین واشنگ کچھ اس طرح سے کی جاتی ہے کہ یہ محض مشینی پرزے اور اس کے آلۂ کار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان کا اپنا ذہن بالکل معطل ہو جاتا ہے لیکن مون اور اس جیسے دھوکہ بازوں سے ہوشیار رہنے کی تلقین کرنا تو بیکار ہے۔ ہم تو خود اپنی طرز زندگی اور موجودہ فلسفہ حیات و حقوق و اخلاقیات سے ''مون'' کے لیے پیرو کار مہیا کرتے ہیں۔

مصنفہ کیوبک کی ایک جھیل میں کشتی پر اپنی بہو عفت کے ہمراہ

ہالینڈ میں اپنے بیٹے تنویر اور بھاوج بیگم علی اشرف کے ہمراہ

کناڈہ میں لیک لوئس کے سامنے چہل قدمی کرتے ہوئے

ہالینڈ میں ایک پکنک پوائنٹ پر

ہالینڈ کی ایک شاہراہ پر سیر کرتے ہوئے

میکگنی یونیورسٹی کناڈہ میں اپنے ساتھی طلبا و طالبات کے ساتھ